چکبست

(حیات اور ادبی خدمات)

پنڈت برج نرائن چکبست

مصنفہ

ڈاکٹر افضال احمد

ا

جنگِ آزادی کا ایک مردِ مجاہد

چکبست

(حیات اور ادبی خدمات)

یعنی

پنڈت برج نرائن چکبست پر
اردو پی۔ایچ۔ڈی کے لئے مقالہ
لکھنؤ یونیورسٹی

ڈاکٹر افضال احمد
ایم اے۔ ایل ایل بی، پی ایچ ڈی

مُصنّف :- ڈاکٹر افضال احمد

سنہ طباعت :- ۱۹۷۵ء

مطبوعہ :- سرفراز قومی پریس
نادان محل روڈ لکھنؤ

قیمت فی جلد :- بیس ۲۰ روپے

کاتب :- نصرت علی

ملنے کا پتہ :- چاندی خانہ
ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ

یہ کتاب اُترپردیش اُردو اکاڈیمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی
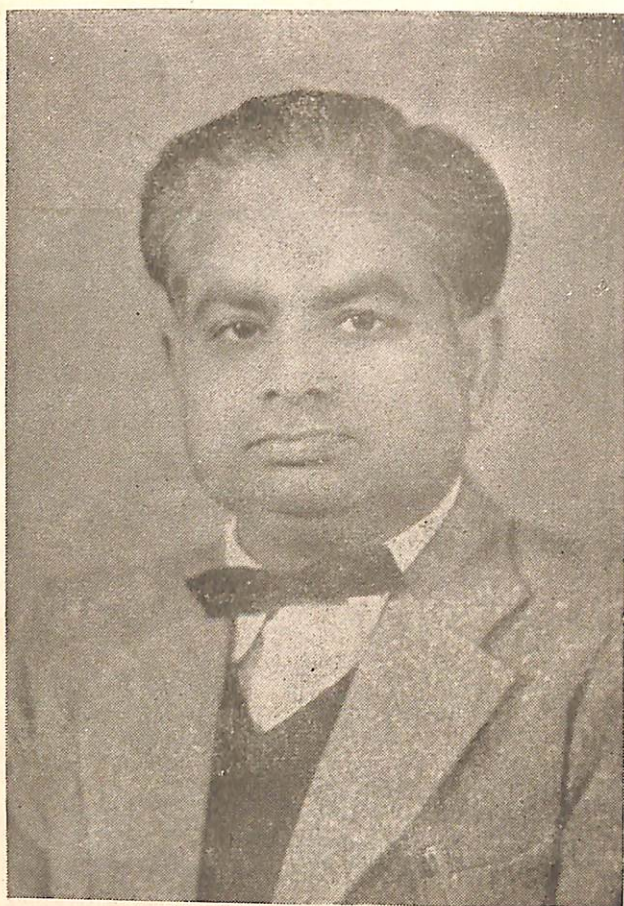
ڈاکٹر افضال احمد

استاد محترم جن کی آج کمی محسوس کرتا ہوں

Late Professor Syed Ehtisham Husain

اِنتساب

مَیں اپنی اس ناچیز تصنیف کو اپنی
والدہ مرحومہ کے نام نامی سے معنون
کرتا ہوں جن کی محنت، محبّت، اور
شفقت کی وجہ سے آج یہ کتاب
پیش کرنے کے قابل ہوں۔

افضال احمدؐ

گذارشِ احوالِ واقعی

احباب کے تقاضے نہ ہوتے تو شاید اس کتاب کے چھپنے کی نوبت نہ آتی۔ ان پندرہ سالوں میں غمِ روزگار نے اتنا موقع بھی نہ دیا کہ اِس طرف رجوع ہوں۔

مَیں اُترپردیش اُردو اکاڈمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اِس کے مالی اشتراک سے یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔

آج استادِ محترم حضرت احتشام حسین مرحوم موجود نہیں، جن کی نگرانی میں یہ کتاب لکھی گئی تھی، مرحوم کا وعدہ تھا، کہ تعارف مرحوم لکھیں گے، افسوس آج وہ موجود نہیں اس لئے میں یہ کتاب بغیر کِسی تعارف کے شائع کرا رہا ہوں۔

لکھنؤ یونی ورسٹی نے مجھے اِس کتاب پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری عنایت فرمائی ہے اور اجازت دی کہ اس کو شائع کراؤں۔

افضالؔ

فہرست مضامین

نقشہ کشمیری محلہ ۱۹۰۷ء

راستہ درگاہ حضرت عباس

مکان بکیش گرو

مکان بہار والوں کا

مکان بھٹپوری والوں کا (جسمیں چکبست شروع میں رہتے تھے)

مکان آغا وزیر حسن

مکان کامتا ناتھ

کشمیری محلہ

مکان چکبستا

مکان گنجور والوں کا

مکان ترلوکی ناتھ کول

مکان پنڈت سورج نرائن بہار

مکان چاند نرائن کچلو

چوک

منصور نگر

عکس موجودہ مکان ساٹھ حویلی فیض آباد۔ جہاں چکبست پیدا ہوئے (سامنے سے)

عکس موجودہ مکان ساٹھ حویلی۔ فیض آباد جہاں چکبست پیدا ہوئے (اندر سے)

پنڈت برج نرائن چکبست

مقدمہ

لکھنوی شاعری برابر اعتراضات کا نشانہ بنتی رہی ہے اور تمام مطالعہ کرنے والوں نے ہمیشہ ایسے شعرا اور ایسے شاعرانہ خیالات پر بحث کی ہے جس میں اکثر یہاں کی شاعری کے ایک ہی رخ کو پیش کیا گیا ہے اور جس کے مطالعہ سے عام طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہندوستان کے دوسرے شاعر اور ادیب زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو لبیک کہہ رہے تھے اس وقت بھی لکھنؤ اپنی محدود دنیا میں محوِ خواب تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ میں شاعری کی ایک ایسی روایت بھی پروان چڑھ رہی تھی جو محض زبان اور بیان کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ شاعری کے لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت اور جاذبیت رکھتی ہے۔ اس کی مثال میں آتش اور انیس کا سرمایہ کلام پیش کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ واضح مثال "پیامبر دورِ جدید" پنڈت برج نرائن چکبست کی ہے جن کے یہاں قدیم اور جدید روایات اور خیالات کا ایک خوشگوار سنگم ملتا ہے۔ جو زبان اور بیان کی ان تمام خوبیوں کا خیال رکھتے ہیں جنھیں لکھنؤ نے امتیاز بخشا اور سربلند کیا اسی کے ساتھ ان کے یہاں عہدِ جدید کے تقاضے اور جدید ذہن کے پیدا کردہ سوالات کے جوابات بھی ملتے ہیں۔ چکبست کی شاعری اور نثر کے مطالعہ کے ذریعہ ہم لکھنؤ کی ایسی شاعرانہ خصوصیات کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں جو اگر عالم گیر نہیں تو ہندوستان گیر ضرور ہیں۔

مقالہ کے لئے چکبست کو منتخب کرنے کی تحریک سید احتشام حسین صاحب کا مضمون "چکبست بہ حیثیت پیامبر دورِ جدید" کے مطالعہ سے ہوئی اسی وقت یہ بھی احساس ہوا کہ اسی سلسلہ میں لکھنؤ کی شاعرانہ روایات اور بدلتے ہوئے حالات میں ان روایتوں میں ترمیم و تبدیلی کا مطالعہ بھی ہو جائے کا جس کی طرف سے نقادوں نے

غفلت برتی ہے۔ اس سلسلہ میں میری خوش قسمتی یہ کہ احتشام حسنا کی نگرانی بھی حاصل ہو گئی جس نے اس خیال کی تکمیل کے لئے ایک بہترین موقع فراہم کر دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ اس وقت تک چکبست پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا تھا اس حقیقت نے بھی میری ہمت بندھائی اور میں نے اپنے مقالہ کے لئے چکبست کا انتخاب کر لیا۔

اس فیصلہ کے بعد جو سب سے بڑی دقت پیدا ہوئی وہ اس موضوع پر کتابوں کی نایابی تھی لیکن خوش قسمتی سے ابھی چکبست کی جاننے والی چند ایسی ہستیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ دقت بڑی حد تک آسان ہو گئی۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل سوال نامہ تیار کیا گیا تاکہ اس کی روشنی میں ان حضرات سے معلومات حاصل کی جائیں۔

سوال نامہ

۱۔ چکبست کی زندگی کے بارے میں ایسی باتیں جو عام لوگ نہیں جانتے ہیں۔

۲۔ ان کی عادات و اطوار۔ پسندیدگی، ناپسندیدگی۔ رہن سہن وغیرہ۔

۳۔ ان کے سیاسی خیالات۔

۴۔ کن لیڈروں سے متاثر تھے۔

۵۔ کن کن ادیبوں، شاعروں اور کتابوں سے متاثر تھے۔

۶۔ کن خاص فلسفیوں اور عالموں سے متاثر تھے۔

۷۔ کشمیریوں کی اصلاح کے متعلق کیا خیالات تھے۔ کیا عام ہندوستانیوں کی اصلاح کی کوشش بھی کی۔

۸۔ شعر و ادب کے بارے میں کوئی ایسی بات جو ان کے مضامین میں نہیں ملتی ہو۔

۹۔ آپکے خیال میں کیا صبح وطن کے علاوہ کچھ اور بھی کلام موجود ہے اور کیا وہ مل سکتا ہے۔

۱۰۔ کیا آپ کے پاس ان کے خطوط موجود ہیں۔

۱۱۔ کن لوگوں سے ملنا چاہیئے کہ چکبست کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔

۱۲۔ کیا آپکے پاس مراسلہ کشمیر۔ صبح امید اور بہار کشمیر، یا ایسے رسائل کے فائل ہیں جن میں ان کا کلام چھپا ہو۔

۱۳۔ کس کی شاگردی اختیار کی اور کیا کوئی ان کا شاگرد تھا۔

۱۴۔ ان کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

۱۵- ان کی نثر۔ تنقید۔ ڈرامہ، عام مضامین کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

اس سوال نامہ کو لے کر جس شخص سے میں سب سے پہلے ملا وہ پنڈت برج کشن گرٹو صاحب ریٹائرڈ ریلوے مجسٹریٹ ہیں۔ چکبست اور یہ عزیز بھی ہوتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی پنڈت پرتاپ کشن گرٹو چکبست کے خاص دوست اور ہم جماعت تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ چکبست نے انکا مرثیہ "ایک جوان مرگ دوست" کے عنوان سے لکھا ہے جو انکے دیوان صبح وطن میں موجود ہے۔ گرٹو صاحب کے والد کا انتقال انکے بھائی کے انتقال سے قبل ہوگیا تھا۔ اب بھائی کے انتقال کے بعد چکبست مرحوم ہی انکے نگراں تھے۔ گرٹو صاحب چکبست کو "گرو دیو" کہتے ہیں اور انکی ویسی ہی عزت کرتے ہیں۔ گرٹو صاحب نے چکبست کے متعلق مواد کے جمع کرنے میں بڑی مدد کی۔ جو سامان انکے پاس تھا وہ خود دیا۔ اس کے علاوہ میرے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں ہر اُس شخص کے پاس تشریف لے گئے جس سے کچھ مواد حاصل ہو سکتا تھا۔ ان ہی کے مشورے سے میں الہ آباد گیا، جہاں ان کے تعارفی خطوط کی بدولت مجھے کافی سامان مل گیا۔ خود انھوں نے مجھے جو سامان عنایت فرمایا اس کی فہرست مندرجہ ذیل ہے :-

۱- چکبست کی ڈائری۔ ۱۹۱۹ء کی۔

۲- "کشمیر ینگ مین ایسوسی ایشن" کلب کی سالانہ رپورٹ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۶ء

۳- "کشمیر ینگ مین ایسوسی ایشن" کلب کی ہفتہ وار رپورٹ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۶ء

۴- ۲ عدد خط۔

۵- رسالہ بہار کشمیر کی تمام جلدیں۔ مع چکبست نمبر

۶- لیڈر اخبار ۱۹۱۶ء کے۔ جس میں "بیوہ کی شادی" کی بحث چلی تھی۔

یہ مواد دینے کے ساتھ ساتھ چکبست کی حیات پر انھوں نے کافی روشنی ڈالی اور اپنی تمام معلومات سے آگاہ فرمایا۔

گرٹو صاحب کے بعد میں جن صاحب سے ملا وہ چکبست کے رشتہ دار۔ ہم عمر۔ اسکول اور کالج کے ساتھی۔ ہم محلہ بلکہ مکان کے سامنے رہنے والے اور اُن کی زندگی سے واقف ترلوکی ناتھ کول صاحب (سابق ایم ایل اے) ہیں۔ یہ بہرائچ میں وکالت کرتے ہیں۔ اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اُن کے پاس چکبست

کی شاعرانہ زندگی سے متعلق ایک بہت ہی اہم خط ملا۔ اب تک ہر شخص کا خیال تھا کہ
چکبست کسی کے شاگرد نہ تھے لیکن اس خط نے یہ مسئلہ بالکل طے کر دیا۔ اس خط کی تفصیل
چکبست کی حیات میں پیش کی گئی ہے۔ چکبست کے انتقال کے بعد کشمیری حضرات نے جو
"چکبست فنڈ" قائم کیا اسکے صدر بھی ترلوکی ناتھ صاحب ہیں۔ انکے بعد میں سورج نرائن
کچلو رٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ تعلیم یو، پی اور آنند نرائن بہادر وکیل سے ملا۔ یہ دونوں
چکبست مرحوم کو اپنے ہوش سنبھالنے کے وقت سے جانتے ہیں اور دونوں کی زندگی چکبست
مرحوم کی نگرانی میں پروان چڑھی۔ ان حضرات نے بھی جو انکو معلوم تھا فراخدلی سے بتایا۔

لکھنؤ کے وکیلوں اور چکبست کے ساتھ کام کرنے والے دو بزرگوں نے بھی اپنی
معلومات سے آگاہ کیا۔ محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ جو چکبست سے اچھے تعلقات رکھنے
کے علاوہ اس مقدمہ میں بھی انکے ہمراہ تشریف لے گئے تھے جس کے سلسلہ میں چکبست
اپنے آخری سفر پر رائے بریلی گئے تھے بلکہ ایوب صاحب اس وقت بھی ہمراہ تھے جب
ان پر فالج کا حملہ ہوا اور پھر انتقال تک رائے بریلی میں رکے رہے اور لاش کے ساتھ ہی
لکھنؤ واپس ہوئے۔ دوسرے صاحب بلرام کشن ماتھر صاحب ہیں۔ یہ چکبست کے دوست
ہیں خود انھوں نے انکے انتقال پر ایک مضمون رسالہ "زمانہ" میں شائع کرایا تھا۔

انکے علاوہ میں چکبست مرحوم کے دونوں بھتیجوں سے ملا۔ اور وہیں چکبست
مرحوم کی بیوہ سے ملاقات ہوئی۔ دونوں بھتیجے چکبست کے انتقال کے وقت اتنے کمسن تھے
کہ اب انکے متعلق وہ کوئی خاص بات نہ بتا سکے۔ چکبست کی بیوہ سے بھی کچھ حالات
کا علم نہو سکا کیونکہ وہ بیچاری اپنی عمر کیوجہ سے اپنی یادداشت پر اعتبار نہیں رکھتی تھیں۔

لکھنؤ کے حضرات سے ملنے کے بعد اب باہر جانے اور حالات وغیرہ معلوم کرنے
کی ضرورت پیش آئی اور سب سے پہلے میں الہ آباد گیا جہاں دیوان رادھے ناتھ
صاحب کول گلشن آپنے ہمراہ لے کر مجھے سب سے پہلے تربھون ناتھ آغا صاحب کے
یہاں گئے یہ چکبست مرحوم کے چھوٹے سالے ہیں چکبست سے اپنے کلام پر اصلاح بھی
لیتے تھے۔ انکے پاس چکبست کی ایک غزل اصلاح شدہ بھی ملی جس کا ذکر مناسب مقام
پر کیا گیا ہے۔

انکے علاوہ جسٹس پی۔ کے۔ کول سے ملا۔ جسٹس صاحب ہردوئی سے ۱۹۰۶ء میں

لکھنؤ آئے تھے اور کشمیری محلہ کے قریب ۱۹۱۶ء تک انکا قیام رہا۔ موصوف نے میرے سوالوں کا جواب خوشی سے دیا۔ الہ آباد ہی میں بشن ناتھ کو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے صبح امید کے تمام پرچے عنایت فرمائے۔ اور اپنی ڈائری سے جو دوران قیام لکھنؤ میں لکھی گئی تھی (جس کا زمانہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک رہا) اس وقت کے حالات اور ضروری واقعات بتائے۔

ان حضرات کے بعد میں چکبست مرحوم کی اکلوتی بیٹی مہاراج دلاری (مسز کاک) سے ملا جنکی عمر اپنے والد کے انتقال کے وقت قریب ۷ سال کی تھی اسوجہ سے ان سے کچھ نہ معلوم ہوسکا۔ انکے علاوہ بعض دوسرے حضرات سے بھی مدد ملی ہے اور انکی معلومات اور خیالات کی چھان بین کرنے کے بعد مقالہ میں شامل کیا گیا ہے۔

ان حضرات سے معلومات حاصل کرنے کے بعد اب فکر یہ ہوئی کہ مضامین اور کتابیں جنمیں چکبست کا کچھ تذکرہ ہو اسکی روشنی میں انکی حیات اور شعر و ادب کے متعلق صحیح رائے قائم کی جائے۔ جو کچھ غیر مطبوعہ ملا اس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ لیکن شاید صرف نام لینا کافی نہ ہو اسلئے ان کی وضاحت کئے دیتا ہوں۔

سب سے اہم وہ رجسٹر ہیں جو گرڈ صاحب نے عنایت فرمائے ہیں۔ ان رجسٹروں میں کشمیری کلب کی ساری کاروائیاں مندرج ہیں جس کے بانی اور روحِ رواں چکبست تھے۔ ان رجسٹروں سے کلب کے اغراض و مقاصد، انتظامی امور اور عہدہ داران کا پتہ چلتا ہے۔ ان رجسٹروں میں کاروائی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تقریریں اور بحثیں بھی تحریر کی گئی ہیں۔ ہر ہفتہ وار جلسے کی عام طور پر صدارت چکبست مرحوم ہی کرتے اور اگر صدارت نہ بھی کرتے تو جلسہ کی تمام بحثوں کا خاتمہ چکبست کی تقریر پر ہوا کرتا تھا اسکے علاوہ سالانہ جلسے کی صدارت کسی اہم شخص کے سپرد ہوتی اس میں بھی چکبست کی تقریر ضرور ہوتی۔ یہ تقریریں یوں بہت اہم ہیں کہ ان سے مختلف موضوعات پر چکبست کے خیالات کا علم ہوتا ہے۔ یہ تقریریں ان کی شخصیت اور کردار کی نمایاں تصویریں کہی جاسکتی ہیں۔ اسکے علاوہ اور بھی لوگوں کی تقریریں ہیں جس سے پوری طرح اس وقت کے مسائل اور کلب کی حالت اور اسکے دائرہ عمل کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ چکبست کلب کے "نقاد[1]" کہلاتے تھے۔ گو کہ کلب کے بعض ممبران ان سے عمر اور

---

[1] رجسٹر میں لفظ (critic) استعمال ہوا ہے۔

اور تعلیم دونوں میں بڑے تھے پھر بھی کلب کی تمام تر ذمہ داری اور کاروائی ان کے اشارہ پر ہوتی۔ ان رجسٹروں کی روشنی میں چکبست کی حیات کا جو حصّہ نمایاں ہوتا ہے اس کی بحث "حیات اور شخصیت" کے باب میں کی گئی ہے۔

دوسری اہم چیز وہ خطوط ہیں جو مختلف ذرائع سے دستیاب ہوئے۔ گرٹو صاحب نے جو ۲ خط دیے وہ ۱۹۱۸ء کے ہیں۔ اس سال گرٹو صاحب الہ آباد وکالت کی تعلیم حاصل کرنے گئے تھے۔ لکھنؤ کے مقابلہ میں الہ آباد کے کشمیری زیادہ آزاد اور نئی روشنی سے متاثر تھے۔ گرٹو صاحب نے ان کشمیریوں کی لڑکیوں کی آزادی کو پسند نہیں کیا اور رسالہ "ستری درپن" میں ایک مضمون "ہمارے سماج میں کیا دوش ہے" کے عنوان سے لکھا اور اس میں بہت سختی کے ساتھ لڑکیوں کی آزادی کی مخالفت کی۔ چکبست مرحوم نے گرٹو صاحب کے اس مضمون کو دیکھ کر یہ دونوں خط لکھے۔ پہلا خط ۲۸ فروری ۱۹۱۸ء کو لکھا۔ ایک ایک لفظ سے خلوص اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک طرف گرٹو صاحب سے جو خلوص اور محبت ہے وہ نمایاں ہے لیکن وہ اپنی قوم اور قوم کی لڑکیوں کی بُرائی سننا نہیں چاہتے تھے اس کا بہت سخت الفاظ میں جواب دیا ہے۔ جو خطوط ملے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم وہ خط ہے جس سے چکبست کی شاگردی کا مسئلہ حل ہوتا ہے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مواد اس قدر اہم اور نیا ہے کہ اس کی وجہ سے چکبست کی زندگی کے ایک تاریک گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ شاید یہ مقام اس مقالہ کا بہت ہی ضروری اور کار آمد حصّہ قرار پائے جسے پہلی بار پیش کیا جا رہا ہے۔

تیسری ذاتی چیز ڈائری ہے جس میں روزانہ کے پروگرام ہیں۔ مقربات کے علاوہ مجالسِ عزا اور مشاعروں کی شرکت کی تاریخیں ہیں۔ اور اس ڈائری سے کسی خاص چیز کا پتہ نہیں چلتا ہے۔

اسکے بعد ان اخبارات کا ذکر ضروری ہے جس سے مواد کے فراہم کرنے میں مدد ملی۔ "لیڈر" اخبار الہ آباد میں "ایک بیوہ کشمیری کی شادی" کے سلسلہ میں ایک زبردست بحث چلی تھی جس سے چکبست بھی بچ نہ سکے۔ گو کہ ان کا خود کوئی مضمون اخبار میں شائع نہیں ہوا لیکن ان کا نام برابر دونوں طرف لیا جاتا رہا۔ اس سے اس وقت کے حالات اور چکبست کے خیالات اور اثرات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اس بیوہ کشمیری کی شادی میں چکبست پر یہ الزام بھی تھا کہ انھوں نے اس شادی میں مدد نہ دی۔ یہ

بحث کافی عرصہ تک اخبارات میں شائع ہوتی رہی۔ خاص طور پر "لیڈر" میں یہ تمام خطوط نکلے۔ یہ اخبارات بھی برج کشن گرٹو صاحب سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان چیزوں کے علاوہ "کشمیری رسالوں" میں مختلف بحثیں چلتی رہی ہیں جن میں چکبست نے حصہ لیا یا ان سے متعلق ہے۔ خاص طور پر "بہار کشمیر" کا "چکبست نمبر" بڑا اہم ہے۔ اسمیں چکبست کے جاننے والے حضرات نے انکی حیات اور شاعری پر مضامین لکھے ہیں اور نظمیں پیش کی ہیں جس سے انکی حیات اور شاعری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ نمبر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ سو صفحات کا رسالہ ہے۔ جس میں چکبست کی کئی تصویریں اور ان کی تحریروں کے عکس بھی شامل ہیں۔

یہ وہ مواد ہے جو عام طور پر اب تک منظر عام پر نہ آیا تھا اور صرف ایک خاص حلقہ ان چیزوں سے واقف تھا۔ انکے علاوہ جن دوسری کتابوں میں چکبست کی شاعری یا حیات کا ذکر ہے ان سے بحث یہاں کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس سے تو سب ہی چکبست کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ابھی چکبست کو انتقال کئے اتنا کم عرصہ ہوا ہے پھر بھی انکی زندگی کے حالات سے عام طور پر لوگ آشنا نہیں۔ اس وجہ سے اس مقالہ کے لکھتے وقت ہمارا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ جہانتک معلومات حاصل کی جا سکیں ان کو جمع کر دیا جائے۔ یہ معلومات حیات۔ شخصیت۔ شخصیت کا ارتقا کے متعلق ہوں یا شاعری اور نثر نگاری کے متعلق۔ کیونکہ ابھی وہ چند ہستیاں باقی ہیں جنھوں نے چکبست کو بہت ہی نزدیک سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ لیکن وہ سب کب تک باقی رہ سکتے ہیں اسوجہ سے انکے حالات جو آج معلوم ہو سکتے ہیں چند برسوں کے بعد معلوم ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

اس سارے مقالے میں کسی ایک حصہ پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ حیات شاعری اور نثر نگاری اور ہر چیز کو جہاں تک ممکن ہو سکا ہے واضح اور مکمل طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ایسی باتوں کو جگہ نہیں دی گئی ہے جن کی صحت پر مکمل بھروسہ نہیں ہے اور نہ وہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جن سے چکبست کی شخصیت یا شاعری کے سمجھنے میں مدد نہ مل سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اس قسم کا تمام مواد خواہ وہ حیات شاعری یا نثر نگاری جس سے بھی متعلق ہو پیش کیا گیا ہے جس کی

مدد سے انکے مقام کا تعین کیا جاسکے اس سلسلہ میں ہم نے غیر مطبوعہ کلام اور اس مواد سے بھی مدد لی ہے جس سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں۔

چکبست کے عہد میں جو ادبی اور سیاسی خیالات رائج تھے وہ ایک عام مطالعہ کرنے والے کو بڑی دشواری میں مبتلا کرتے ہیں کیونکہ بدلتے ہوئے حالات سے مختلف قسم کے ترقی پسندانہ اور رجعت پسند خیالات ایک دوسرے میں گتھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس طرح ادب میں قدیم اور جدید کی بحث زور و شور کے ساتھ چل رہی تھی، اور ایسی روایات وجود میں آرہی تھیں جو نہ مکمل طور پر قدیم تھیں اور نہ جدید، چکبست ایک باشعور انسان اور شاعر ہونے کی حیثیت سے ہوا کے ہر رُخ کے ساتھ بہنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس مقالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان پیچیدہ حالات میں چکبست کے ذاتی خیالات اور تصورات کو واضح طور سے پیش کیا جائے اور عناصر کا تجزیہ کیا جائے جنھوں نے انکے خیالات میں استواری بخشی اور انکی شاعری کو متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہندوستان اور خاص طور سے اودھ کے سیاسی اور ادبی ماحول پر بھی تفصیلی نظر ڈالی ہے۔

جب ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر اس مقالہ کا مطالعہ کیا جائے گا تو اندازہ ہوگا کہ حالات کے یکجا کرنے، بعض گتھیوں کو سلجھانے، اودھ کی ادبی روایات کا صحیح جائزہ لینے اور چکبست کے مرتبہ کا تعین کرنے میں کس قسم کی دشواریاں پیش آئی ہیں اور انھیں متوازن انداز میں حل کرنے کے لئے کیا نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔

سوانح حیات اور شخصیت کا ارتقاء

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء کی شب میں محلہ راتھ حویلی شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے اس وقت ان کی والدہ کا قیام اپنے بھائی لالتا پرشاد کے یہاں تھا۔ چکبست کے والد پنڈت ادت نرائن چکبست پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ پنڈت ادت نرائن چکبست خود شاعر تھے، اور یقین تخلص کرتے تھے۔ ان کا صرف ایک شعر دستیاب ہو سکا ہے۔ اور یہی ایک شعر ان کے بلند پایہ شاعر ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

اللہ اللہ اثر نالوں کا تیرے بلبل
پردۂ غیب سے گل چاک گریباں نکلا

پندرھویں صدی میں کشمیریوں نے جب اپنے وطن کو چھوڑ کر پنجاب۔ دہلی۔ یو۔ پی۔ اور بہار کو اپنا وطن بنایا تو ان لوگوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا اپنی علمی لیاقت کو برقرار رکھا۔ چکبست کا خاندان بھی علمی حیثیت میں بلند تھا۔ لیکن انکے والد نے تمام جائداد جو انکے بزرگوں نے چھوڑی تھی ختم کر دی تھی[1]۔

ابھی چکبست صرف پانچ ہی سال کے تھے کہ ۱۸۸۷ء میں انکے والد کا انتقال ہو گیا۔ اسکے بعد انکی والدہ کو مجبوراً اپنے بھائی پنڈت لالتا پرشاد صاحب کے ساتھ قیام کرنا پڑا جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں ملازمت کرتے تھے اور جن کا قیام کشمیری محلہ میں تھا۔ چکبست کی تعلیم پرانے طریقے سے گھر پر شروع ہوئی۔ ایک مولوی صاحب نوکر رکھے گئے جنھوں نے اردو فارسی کی کتابوں سے تعلیم شروع کی والد کے انتقال کیوجہ سے انکی تعلیم دیر سے شروع ہوئی ۱۸۹۵ء میں کاظمین اسکول میں نام لکھوایا گیا جو اسوقت صرف ایک مڈل اسکول تھا۔ یہاں سے ۱۸۹۷ء میں مڈل پاس کیا اسی زمانے میں انکے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست لکھنؤ میونسپلٹی میں ملازم ہو گئے۔ جبسے گھر کی حالت بہتر ہو گئی۔ مڈل پاس کر کے گورنمنٹ

---

[1] پنڈت ترلوکی ناتھ صاحب کا خط راقم الحروف کے نام مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۵ء جس سے یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

جوبلی کالج میں جو اسوقت صرف ہائی اسکول تھا نام لکھوایا اور یہاں سے ۱۹۰۰ء میں
دسواں درجہ پاس کرکے کیننگ کالج میں داخل ہوگئے جہاں سے ۱۹۰۲ء میں ایف۔ اے
پاس کیا لیکن امتحان کے بعد سخت علیل ہوگئے اور تعلیم کا سلسلہ ایک سال کیلئے رک گیا
۱۹۰۳ء میں پھر بی۔ اے میں نام لکھواکر ۱۹۰۵ء میں کامیابی حاصل کی اور اسکے بعد وکالت
کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسوقت تک لکھنؤ یونیورسٹی میں وکالت کی تعلیم تو ہوتی تھی لیکن
امتحان نہ ہوتے تھے۔ اور طلباء کو امتحان دینے الہ آباد جانا ہوتا تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں
اسوقت وکالت کے دو طرح کے امتحان ہوتے تھے۔ ایک ہائیکورٹ کا امتحان جو پلیڈر شپ
کا امتحان کہلاتا تھا۔ دوسرا یونیورسٹی کا ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان تھا جسے چکبست نے
۱۹۰۷ء میں پاس کرلیا۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد چھ ماہ کسی تجربہ کار وکیل کے
ساتھ ٹریننگ لینا ہوتی ہے۔ چکبست نے لکھنؤ میں شہنشاہ حسین رضوی کے ساتھ ٹریننگ
لینی شروع کی اور اسکو پورا کرکے انھیں کے ساتھ وکیل کی حیثیت سے کام بھی شروع کردیا۔

انکے ابتدائی ادبی شعور پر کشمیری محلہ کا ماحول ہے جہاں بچپن ہی سے ان کا
قیام تھا اسلئے ذرا اس مقام کا نقشہ بھی دیکھنا چاہیئے یہ نقشہ انیسویں صدی کے آخر
زمانہ کا ہے جسمیں اب تھوڑی بہت تبدیلی ہوگئی ہے۔ کشمیری محلہ میں مڑتے ہی بائیں طرف
پہلا مکان کاشی پرشاد صاحب کا تھا۔ دوسرا آغا وزیر حسن کا اور تیسرا بھٹ پوری والوں کا
اس سے ملا ہوا وہ مکان ہے جو بہار والوں کا مکان کہلاتا تھا۔ اسمیں چکبست رہتے
تھے۔ اسکے بعد بکشن گرو کا مکان تھا جسکے بعد وہ گلی شروع ہوجاتی ہے جو موجودہ وقت
میں کشمیری محلہ گرلس اسکول کی طرف لیجاتی ہے۔ اس گلی میں پہلا مکان پنڈت برج کشن گرٹو
کا تھا۔ اسکے مقابل راستہ کی دوسری طرف پہلا مکان چاند نرائن کچلو صاحب کا تھا اسکے
بعد چکبستا صاحب کا مکان تھا۔ اسکے بعد پھر گلی شروع ہوجاتی ہے۔ چکبست کا قیام
۱۹۱۵ء تک کشمیری محلہ میں رہا۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں انھوں نے اپنا دفتر مکان سے ہٹاکر
کرسچین کالج کے سامنے جو راستہ بارود خانہ کو جاتا ہے اسکے داہنی جانب کے مکان میں
قائم کرلیا تھا۔ اسی زمانہ میں گولہ گنج میں پنڈت جگت نرائن ملا (پنڈت آنند نرائن ملا
کے والد) کا قیام تھا۔ انکے مکان کی پشت پر پنڈت رگھبیر دیال ستکل کے مکان کو
کرایہ پر لیکر چکبست رہنے لگے۔ تین سال تک یہاں قیام رہا۔ اسکے بعد تقریباً سال بھر

سندر باغ میں گوپال داس کے مکان میں قیام کیا اور آخرکار گولہ گنج میں مرزا سمیع اللہ بیگ
صاحب کا مکان کرایہ پر لے کر اٹھ آئے۔ اس مکان میں اخیر تک قیام رہا۔ ان مختلف
قیام گاہوں کا ذکر کرنا اسلئے ضروری ہے کہ کشمیری محلہ چھوڑنے کے بعد کشمیری کلب کو
انکی زندگی میں وہ جگہ حاصل نہ رہی جو ۱۹۱۴ء تک حاصل تھی۔ انکے بڑھتے ہوئے وکالت
کے کام، جوانی کے ساتھیوں کا تتر بتر ہو جانا، اور عام سیاسی زندگی سے دلچسپی بھی
کشمیری کلب سے عدم توجہی کا سبب ہو سکتی ہے۔ لیکن غالباً کشمیری محلہ سے نکل آنا اس کا
سب سے اہم سبب تھا۔ اور چونکہ کشمیری کلب کو ان کی زندگی میں خاص جگہ حاصل تھی اور اس
کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا، اسلئے یہاں پر اسکی طرف اشارہ ضروری تھا۔

جس طرح ہندوؤں میں چار ورن یا ذاتیں ہوتی ہیں اسی طرح سے کشمیری پنڈتوں
میں تین گروہ ہوا کرتے تھے۔ اول "گور" جو مذہبی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور مذہبی تعلیم دیتے
تھے۔ دوسرا گروہ "کارکن" کا ہوتا تھا جو نوکری۔ تجارت اور دیگر قسم کے کام کرتا تھا۔
تیسرا گروہ "بھنڈاری" کا تھا۔ جو باورچی ہوتے تھے۔ لیکن کشمیری پنڈتوں میں عام ہندو
مذہب والی سختی نہ تھی۔ اگر ایک انسان اپنا پیشہ تبدیل کرتا تو وہ دوسرے گروہ میں شامل
ہو سکتا تھا۔ اسکے علاوہ آپس میں شادی بیاہ بھی ہوتے تھے۔ چکبست کا خاندان شروع
ہی سے 'کارکن' تھا اور آج بھی کارکن ہی ہے۔

کشمیری پنڈت مذہبی حیثیت سے دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے
جو آگ کی پوجا کرتا ہے جسکو "جوالا" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں ایک پہاڑ کی ایک
چوٹی پر ایک ایسا مقام ہے جس سے برابر آگ کی شعاعیں نکلا کرتی ہیں۔ جب کسی کو کوئی
چیز اس پر چڑھانی ہوتی وہ اس چیز کو ایک صاف تھالی میں رکھ کر اس آگ کے قریب لے
جاتا ہے۔ اگر آگ کی لپٹ اس کی طرف مڑ کر اس پر سے گذر گئی تو خیال کیا جاتا ہے کہ
اسکی نذر قبول ہو گئی ورنہ نہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو پانی کی پوجا کرتا ہے جس کو یہ لوگ
"رگنیا" (Ragnya) کہتے ہیں۔ سری نگر میں ان کا ایک خاص مندر ہے۔
جس میں ایک چوکور پتھر ہے۔ جس کے اندر پانی بھرا ہے، جس کا رنگ سنہرا رہتا ہے۔ اگر کسی
وقت پانی کا رنگ بدلنے لگتا ہے تو خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہونیوالی ہے
اور لوگ پوجا پاٹ کرنے لگتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں صرف ایک فرق ہے باقی چیزوں

ہیں بالکل ہم خیال ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو آگ کی پوجا کرتے ہیں وہ کنوار اور چیت کے چاند کے پہلے نو دن گوشت ضرور کھاتے ہیں۔ اور یہ زمانہ نورات کہلاتا ہے۔ لیکن جو لوگ پانی کی پوجا کرتے ہیں وہ لوگ اس زمانے میں گوشت نہیں کھاتے ہیں[۱]۔ برج نرائن چکبست پانی کی پوجا کرنے والے گروہ میں تھے[۲]۔

کشمیری پنڈتوں میں خاندان کے نام مختلف وجوہ سے پڑ گئے ہیں خاص طور سے جب کشمیریوں نے ترک سکونت اختیار کیا تو جو شخص جس گاؤں یا شہر کا رہنے والا تھا اکثر اسکی رعایت سے اسکا نام پڑ گیا مثلاً "شیوپور ایک گاؤں ہے وہاں کے رہنے والے شیوپوری کہلائے اسکے علاوہ کچھ لوگوں کے نام ان کے آبائی پیشہ کی رعایت سے پڑ گیا، مثلاً" بزاز، صراف وغیرہ کچھ چڑھوں کی وجہ سے مثلاً لٹھ ساز، سوٹا، ٹوپا غالبًا چکبست نے اس وجہ سے لالہ سری رام صاحب کو ایک خط میں اس طرف اشارہ کیا ہے[۳]۔

"چکبست میرا عرف ہے نہ کہ تخلص"

چکبست کا خاندان دراصل شیوپور کا رہنے والا تھا۔ اس وجہ سے یہ لوگ شیوپوری کہلائے لیکن انکے بزرگوں میں سے ایک صاحب بہار میں چکلہ دار ہوئے جس کی رعایت سے انکے خاندان کا نام چکبست پڑ گیا[۴]۔ چکبست کے خاندان کے متعلق دو اور اشارے ملتے ہیں۔ محمدالدین فوق صاحب نے اپنی کتاب "تاریخ اقوام کشمیر" حصہ دوم میں تحریر فرمایا ہے:۔

"کشمیر میں چک ایک قوم ہے جس نے کئی سال تک کشمیر میں حکومت کی ہے۔ لیکن چک زمین کے ایک طویل وعریض ٹکڑے کو بھی کہتے ہیں۔ چک آباد کرنے کا رواج آج سے دس سال پیشتر تک رہا ہے۔ ان زمینوں پر جو چکوک کے آباد کرنے کے لئے زمینداروں یا اور لوگوں کو دی جاتی تھیں جو افسر تعینات ہوتے تھے ان کو چکبست کہتے تھے بلکہ اس عہدہ کا نام ہی چکبست

---

[۱] باد بہار کشمیر "بے نظیر" از ہری دھر منشی۔ تاریخ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۶ء گوالیار

[۲] بیان پنڈت برج کشن گرٹو صاحب

[۳] تذکرہ ہزار داستان۔ معروف بہ خمخانۂ جاوید جلد دوم مرتب لالہ سری رام ۱۹۱۱ء صفحہ ۳۲۹

[۴] بیان دھرم ناتھ چکبست ساکن کشمیری محلہ لکھنؤ۔

تھا۔ زمانہ قدیم میں ان کو قانونگو بھی کہتے تھے۔ ایسے افسروں کے پاس باقاعدہ عطائے چکوک کی کتاب ہوا کرتی تھی۔ مسلمانوں میں تو کوئی چکبست نہیں سنا گیا البتہ پنڈتوں میں وہ بھی کشمیر کے مہاجر لکھنوی پنڈتوں میں ایک چکبست خاندان موجود ہے۔[۱]"

خاندان چکبست کے ایک فرد کا خیال ہے :۔

"چکبست پہلے چک تھے۔ جب پٹھانوں نے چک بادشاہوں کو شکست دی تو بہت سے لوگوں کو جو چک تھے گرفتار کر لیا گیا اور اس زمانے سے یہ لوگ چک بند ہوئے۔ لیکن دھیرے دھیرے اس نام میں تبدیلی ہوئی اور چکبست کہلانے لگے۔[۲]"

ان روایات میں سے کس کو صحیح تسلیم کیا جائے یہ طے کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن جہانتک خود چکبست کے قول کا تعلق ہے وہ عرف کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو مشکوک ہے۔ کیونکہ عرف عام طور پر اس نام کو کہتے ہیں جس سے کوئی شخص شہرت پاتا ہے یا گھر والے کسی وجہ سے اس نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ مگر یہاں چکبست کا نام ان کے والد بھائی اور دیگر عزیزوں کے ساتھ بھی ملتا ہے۔ صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اس لئے اسے عرف نہیں کہہ سکتے۔ یہ البتہ درست ہے کہ چکبست سے اُردو ادب کی دنیا میں سوائے پنڈت برج نرائن چکبست کے کسی اور کی طرف خیال نہیں جاسکتا ہے۔ باقی تین بیانات میں سے پنڈت دھرم ناتھ چکبست صاحب کا یہ خیال کہ صوبہ بہار میں آباد ہونے کے بعد جب چکلہ دار ہوئے تب چکبست کہلائے اطمینان بخش نہیں ہے۔ کیونکہ صرف کشمیری پنڈت ہی چکبست کہلائے اور دوسرے چکلہ دار کیوں اس نام سے منسوب و مشہور نہ ہوئے۔ ایسی حالت میں محمد الدین فوق اور پنڈت جگت نرائن چکبست کے قول قابل ذکر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے تفصیلات میں فرق ہے لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کہ چکبست کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں اس چک قوم سے ضرور ہے جو کشمیر میں آباد تھی۔ چونکہ اس کا گہرا تعلق چکبست کی شاعری

۱؎ تاریخ اقوام کشمیر حصہ دوئم۔ صفحہ ۱۴۱ ۱۹۴۱ء

۲؎ بیان جگت نرائن چکبست ــــ ساکن وجے نگر لکھنؤ

یا شخصیت سے نہیں ہے اسلئے اس بحث کو اور زیادہ بڑھانا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

چکبست ابھی بی۔ اے میں تھے کہ ان کی پہلی شادی ہوئی۔ یہ شادی پنڈت پرتھوی ناتھ صاحب ناگو کی لڑکی کے ساتھ ہوئی جو کہ اس وقت لینڈ ریکارڈ (Land Record) آفس میں ملازم تھے۔ لیکن شادی کے دوسرے سال لڑکے کی ولادت ہونے میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ لڑکا بھی چند یوم زندہ رہ کر اپنی ماں سے جا ملا۔ دوسری شادی ۱۹۰۷ء میں پنڈت سورج ناتھ آغا سرکاری وکیل کی دختر کھما دیوی کے ساتھ ہوئی۔ ان سے کئی اولادیں ہوئیں لیکن صرف ایک لڑکی اسوقت زندہ موجود ہے۔ جس کی شادی ہر چند ناتھ کاک کے ساتھ ہوئی ہے۔ چکبست کی دوسری بیوی ابھی بقید حیات ہیں۔

چکبست نہایت ہی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ وہ تیزی اور ہوشیاری ان میں نہ تھی جو عام طور سے کشمیری پنڈتوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن وہ بے حد سمجھدار تھے اور ذرا سے اشارہ پر پوری بات کو سمجھ لیتے تھے۔ گھر کی زندگی میں انھوں نے کبھی زیادہ دخل نہیں دیا۔ کیونکہ اول تو انکی والدہ حیات تھیں جن کا انتقال چکبست کے انتقال کے بعد ہوا اور دوسرے ان کے بڑے بھائی اور بھاوج موجود تھے اس وجہ سے یہ گھر کی زندگی سے ذرا آزاد رہے۔ لیکن کشمیری پنڈتوں کی بے راہ روی نے انھیں چین نہ لینے دیا اور تمام زندگی انھوں نے ان خامیوں اور خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

شاعری کا شوق ان کو بچپن ہی سے تھا۔ اس کے متعلق بعض واقعات مختلف حضرات سے معلوم ہوئے۔ انکی داستان حیات کے مختلف پہلوؤں کو واضح طور سے پیش کرنے کے لئے ایک واقعہ نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ابھی آٹھ نو برس کی عمر تھی کہ ایک روز اپنے کوٹھے پر کھڑے تھے۔ سامنے نواب وزیر حسن صاحب کبوتر اڑا رہے تھے کہ اتنے میں کسی اور کا ایک کبوتر نواب صاحب کے کبوتروں کے جھنڈ میں شامل ہو کر گھر میں آگیا۔ وزیر حسن صاحب نے فوراً کبوتر کو پکڑ لیا۔ پھر اس کے پروں میں گرہ لگا کر جیسے ہی اس کو چھوڑا، نہ معلوم کیسے گرہ کھل گئی اور کبوتر اڑ گیا۔ نواب صاحب دیکھتے

ے مجھ سے خود کھمیا دیوی چکبست نے یہ واقعات بیان فرمائے۔

کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ چکبست نے جو اس تمام واقعہ کو دیکھ رہے تھے فوراً ایک شعر کہا ؎

تڑپ کر توڑ ڈالے بند بازو کے کبوتر نے
بہت باندھا تھا کس کر ایک پر کو دوسرے پر سے

شاعری کا شوق دھیرے دھیرے بڑھتا ہی گیا۔ جو کبھی احباب کے مرثیے کی شکل میں، کبھی قوم کے نوحے کی صورت میں، اور کبھی غزل کے روپ میں سامنے آنے لگا۔ زیادہ تر لوگ یہی خیال کرتے ہونگے کہ چکبست نے ایک نہایت ہی سنجیدہ زندگی گذاری اور وہ خوش طبعی سے بالکل الگ رہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ وہ عام طور پر ایسے ہی دکھائی دیتے تھے لیکن ذرا ان کی بے تکلف شوخ مزاجی دیکھئے، اپنے ہم پیشہ وکیلوں کی حالتِ زار کیونکر بیان کرتے تھے ؎

مرتے دم جب ملک الموت مقابل آیا
دلِ ناشاد یہ سمجھا کہ مؤکل آیا

ہم لائے مؤکل کو تدبیر اسے کہتے ہیں
وہ پھنس کے نکل بھاگا تقدیر اسے کہتے ہیں

اور ذرا وکیل صاحب کے دفتر کا نقشہ ملاحظہ ہو ؎

کرسی سے عیاں لرزشِ یک پائی ہے — میز ایسی ہے گویا کہ پڑی پائی ہے
قانون کا غم ہے نہ مؤکل کا گزر — آفس بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

چکبست کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ رسالہ بہار کشمیر لاہور کا چکبست نمبر نکلا اس میں بھی دو بزرگوں نے اس بات کو صاف طور پر لکھا ہے۔ پنڈت جگ موہن ناتھ رینہ شوق مؤلف بہار گلشن کشمیر تحریر فرماتے ہیں :-

"چکبست کو کسی استاد سے تلمذ حاصل نہ تھا بلکہ ان کی روشن دلی خود ان کی رہبر تھی"[۱]

اسی طرح تاریخ ادب اردو (مصنفہ رام بابو سکسینہ صاحب) میں یہ عبارت ملتی ہے[۲]

---

[۱] صفحہ رسالہ بہار گلشن کشمیر فروری ۱۹۳۹ء

[۲] تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ مترجم مرزا محمد عسکری صفحہ ۱۷۸ (ضمیمہ)

"انھوں نے فرسودہ طریقہ استادی و شاگردی کو بھی خیرباد کہا تھا۔ یعنی کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اور صحیح معنی میں تلمیذ الرحمان کہے جانے کے مستحق تھے۔"

پنڈت ترلوکی ناتھ کول ایم۔ ایل۔ اے بھی تحریر فرماتے ہیں :۔

"کسی کی شاگردی شاعری میں اختیار نہ کی یہاں تک کہ تخلص کے بھی گنہگار نہ ہوئے[۱]۔"

الہ آباد میں چکبست کے برادر نسبتی پی۔ این۔ آغا صاحب کے پاس ایک خط ملا اور اس کے ساتھ ہی ایک غزل بھی ملی۔ خط کا مضمون حسب ذیل تھا :۔

" جناب مخدوم و مکرم بندہ تسلیم

بلیتر میں نے ایک غزل آپکی خدمت میں روانہ کی تھی اس کی اصلاح کے لئے مشکور (کذا) ہوں لیکن اب مشاعرے کا جو موقع آیا تو معلوم ہوا کہ وہ طرح یعنی دم میرا۔ قدم میرا۔ اب طرح نہیں ہے۔ اب دوسری غالب کی طرح مقرر کی گئی ہے۔ یعنی 'ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا'

اور ۱۱ ستمبر کو مشاعرہ ہے۔ آج سے تو دو ہی باقی ہیں۔ طرح مذکورہ میں نے ایک غزل تیار کی ہے وہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں مہربانی کر کے جس قدر جلد ممکن ہو عنایت فرمائیے کیونکہ گیارہ تاریخ کو مشاعرہ ہے اور آج تیسری تاریخ ہے۔" (برج نرائن چکبست)

اس کے بعد غزل تحریر ہے ؎

درد دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

غزل میں کل ۲۳ شعر ہیں۔ غزل کے آخیر میں پھر دستخط ہیں اور تاریخ ۳ر دسمبر ۱۹۰۹ء پڑی ہے۔ اس کے بعد ہی اس خط پر استاد کا جواب ہے۔

" بندہ عنایت !

آپ نے شعر خوب فرمائے ہیں۔ کہیں کہیں میں نے دخل دیا ہے۔ امید

---

[۱] صفحہ ۱۸ بہار گلشن کشمیر فروری ۱۹۳۹ء

ہے کہ آپ پسند فرمائیں گے۔ فقط

لیکن استاد نے جواب خط کے آخر میں اپنا نام تحریر نہ فرمایا، اب فکر یہ دامن گیر ہوئی کہ کہ آخر یہ کون صاحب ہیں جنھوں نے چکبست کی غزل پر اصلاح دی ہے۔ اور جنھیں چکبست نے اُستاد کی حیثیت سے مخاطب کیا ہے۔ کچھ مدت کے بعد ایک اور خط جناب ترلوکی ناتھ کول کے پاس ملا جس میں چکبست کا خط' ایک نظم' استاد کا جواب، مع انکے نام کے موجود ہے۔ خط ۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کو کشمیری محلے سے لکھا گیا ہے:۔

"جناب مخدوم ومکرم بندہ!

بعد تسلیم واضح رائے عالی ہو کہ نظم ذیل ایک رسالہ میں اشاعت کے لئے روانہ کرنی ہے۔ لہٰذا اُمیدوار ہوں کہ ازراہ عنایت قدیمانہ اس کو اصلاح فرماکر بندہ کو ممنون فرمائیے، بذریعہ ڈاک اسکو روانہ فرمادیجے گا۔

آپکا خادم
برج نرائن چکبست
کشمیری محلہ

نظم

محیط دہر میں تہذیب کا جو دور ہوا
ہوا بدل گئی رنگ زمانہ اور ہوا

دماغ خانۂ وحشت تھا جائے غور ہوا
خدا کی شان جہاں کا عجیب طور ہوا

گھٹا جو جہل تو سامان عز وجاہ بڑھے
شعور کو جو ترقی ہوئی گناہ بڑھے[1]

نظم کے بعد اُستاد کا خط ہے :۔

مہربان من بعد سلام سنت اسلام واضح ہو کہ میں باہر گیا تھا اس وجہ سے دیر ہوئی اور چار یا پنج روز سے یہ کاغذ تیار ہے۔ انتظار اس کا رہا کہ شاید آپکا کوئی آدمی آئے ورنہ میں بذریعہ ڈاک روانہ کرتا۔ اب مجبور ہو کر بذریعہ بیرنگ روانہ کر رہا ہوں آپ نے بہت خوب فرمایا ہے

---

[1] یہ نظم "اب انگور" کے نام سے صبح وطن میں موجود ہے اسلئے یہاں ایک ہی بند نقل کیا جاتا ہے

اور یہ شوق اگر کچھ دنوں رہا تو آپ کا کلام قابل تعریف کے ہو جائے گا۔ زیادہ

شوق ملاقات۔ فقط

منشی سید افضل علی خاں عفی عنہ،

۱۴ر جنوری ۱۹۰۲ء

(بنظر احتیاط بیرنگ روانہ کیا گیا ہے۔ خط کا عکس پیش کیا گیا ہے)

اس خط کے مل جانے کے بعد سے استاد کا مسئلہ تو طے ہو جاتا ہے کہ منشی سید افضل علی خاں افضل کے چکبست شاگرد تھے۔ حضرت افضل جناب مظفر علی خاں اسیر کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ افضل شاعر کی حیثیت سے کچھ ایسے مشہور نہیں ہیں۔ لیکن انکا شمار لکھنؤ کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ انکے جاننے والے اب بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ وہ لکھنؤ میں زیادہ تر چھوٹے بھیا، کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا مختصر حال خمخانۂ جاوید سے نقل کیا جاتا ہے[1]۔

"افضل الدولہ مظفر الملک سید افضل علی خاں بہادر عرف چھوٹے بھیا آنریری مجسٹریٹ رئیس لکھنؤ پسر تدبیر الدولہ منشی اسیر لکھنوی انگریزی، عربی، فارسی، تینوں زبانوں میں معقول دستگاہ رکھتے ہیں وہی اردو سو ان کی مادری زبان ہے۔ فن شعر میں اپنے والد کے شاگرد ہیں اپنے اطراف میں فن سخن کے اچھے ماہر سمجھے جاتے ہیں بنونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

اے انتظار یار ہے تیری مدد کا وقت
آنکھوں سے بوجھ اٹھ نہیں سکتا ہے خواب کا

اپنے دشمن کو بھی دشمن نہیں کہہ سکتے ہم
دوست کا دوست ہوا جب تو وہ دشمن کیسا

گل ہیں نازک نہ کہیں باغ میں مرجھا جائیں
بار الفت کا کہو ان پہ نہ ڈالے بلبل

امیدوار ہزاروں ہیں لاکھوں خواہش مند
ہے ایک دم ترا کس کس کے دل میں تو آئے

اس طرح چکبست کے تلمذ اور شاعری کا شجرہ سلسلہ حضرت مصحفی سے مل جاتا ہے۔

چکبست کی ابتدائی زندگی کے متعلق معلومات بہت کم حاصل ہو سکی ہیں۔ لیکن جہاں تک پتہ چلتا ہے ان کے خیالات میں شروع ہی سے سنجیدگی اور پختگی نظر آتی ہے۔ اگر ان اثرات کی جستجو کی جائے جنھوں نے ان کی شخصیت اور ان کے ذہن کو

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۳۶۳ از لالہ سری رام مطبع منشی نولکشور واقع لاہور ۱۹۰۸ء

متاثر کیا تو جہاں ایک طرف ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاسی اور سماجی زندگی ہے، وہاں دوسری طرف خود کشمیری پنڈتوں کی وہ حالت ہے جو چکبست کے خیال میں محتاج اصلاح تھی۔ اگر ایک طرف ان کا مطالعہ اور تحصیلِ علم ان کا مددگار رہے تو دوسری طرف وہ افراد ہیں جن کی زندگی چکبست کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی ان میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ جن سے براہِ راست ان سے تعلق تھا۔ اور دوسرے گروہ حضرات جن سے براہِ راست تعلق نہ تھا۔ بلکہ جس طرح اور ہندوستانی متاثر ہو رہے تھے اسی طرح چکبست بھی ان کے اثرات قبول کر رہے تھے۔ پہلے گروہ میں حضرت بشن نرائن در ابر اور بابو گنگا پرشاد ورما آتے ہیں جن سے چکبست بذاتِ خود اور ہر وقت متاثر ہوتے رہے۔ دوسرے گروہ میں گوکھلے۔ تلک۔ گاندھی۔ مسز بسنٹ اور دادا بھائی نوروجی آتے ہیں۔ لیکن جس شخص سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ حضرت بشن نرائن در ابر ہیں جن کے متعلق سر تیج بہادر سپرو تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر پنڈت برج نرائن چکبست کے خیالات میں پختگی اور بلندی اس قدر جلد پیدا ہوئی تو اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انکی علمی اور اخلاقی زندگی پنڈت بشن نرائن در ابر صاحب کی ذات بابرکات سے وابستہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ایک نظم میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے"[1]

کیا زمانہ میں کھلے بیخبری کا میری راز | طائرِ فکر میں پیدا تو ہوا اپنی پرواز
کیوں طبیعت کو نہ ہو بیخودیٔ شوق پہ ناز | حضرتِ ابر کے قدموں پہ ہے یہ فرقِ نیاز
فخر ہے تجھ کو اسی در پہ شرف پانے کا | میں شرابی ہوں اسی رند کے میخانے کا

اس کے علاوہ "نذرانۂ روح" اور نوحہ بشن نرائن در چکبست کے خیالات کی مکمل تصویر ہیں۔

"نذرانۂ روح" میں فرماتے ہیں:۔

دل پر درد کے ٹکڑے جو کئے ہیں یکجا | تیرے قدموں کے لئے تھا یہی میرا تحفا
مگر افسوس کہ یہ دین ادا ہو نہ سکا | اب سرِ لوح پہ ہے نقش یہ پیغامِ وفا

---

[1] رسالہ بہار کشمیر لاہور چکبست نمبر فروری ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۹۷

میرے سودائے طبیعت کو جو افسانہ ہے
مرنے والے یہ تیری رُوح کا نذرانہ ہے

تیرا بندہ رہے دل سے یہی پیمان رہا — طائرِ فکر ترے اوج سے حیران رہا
قدر کرنا تیری سیکھیں، یہی ارمان رہا — یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہے تمنّائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

آگے چل کر اسی "نذرانہ" میں فرماتے ہیں ؎

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا — حسرت آبادِ جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا — زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا

لیکے دنیا سے میں اک مہر و وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

ذرا "نوحہ البشن نرائن در" بھی دیکھتے چلئے، پہلے ہی بند میں جذبۂ محبت اپنا کام کس حد تک کر رہا ہے ؎

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا — بے زبانوں کی زباں دل کا سہارا نہ رہا
گلشنِ علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا — مطلعِ دانش و بینش کا ستارا نہ رہا

سب یہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

دو بند اور سنئے کہ دل کی آواز کس انداز سے سپردِ قلم کی گئی ہے ؎

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے — حسنِ اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے
جذبۂ خیر کی توقیر مٹی جاتی ہے — ہم مٹے جاتے ہیں تقدیر مٹی جاتی ہے

دلِ مایوس محبّت کا عزا خانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دُنیا نہیں ویرانہ ہے

دل ہو تیرا سا تو دنیا کی حقیقت کیا ہے — تن پرستی پہ جو ہو صرف وہ دولت کیا ہے
غیر کو جس سے نہ راحت ہو وہ راحت کیا ہے — جس میں سودا نہ ہو کچھ بھی وہ طبیعت کیا ہے

زندگی یوں تو فقط بازیٔ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

مضامین چکبست میں "پنڈت بشن نرائن در" پر جو مضمون ہے اس سے بھی چکبست کی محبت اور عقیدت حضرت بشن نرائن در سے ظاہر ہوتی ہے، فرماتے ہیں :-

"پنڈت بشن نرائن در کی زندگی ایک ایسے مرد قانع کی زندگی ہے جس نے علم کو دولت اور ملک و قوم کی خدمت کو ذریعہ نجات سمجھا اور آزاد خیالی اور بلند نظری کو انسانی شرافت کا معیار خیال کیا.... پنڈت صاحب موصوف اپنے صفائے قلب حمیت و نیک نیتی اور صبر و استقلال کے لحاظ سے انسانی عظمت کی تصویر ہیں یا یوں کہوں کہ قدرت نے توکّل اور استغنا کے پتلے میں کسی جوگی کی روح پھونک دی ہے .... میں ہمیشہ سے آپ کو اپنا محسن اور فرشتہ رحمت خیال کرتا ہوں۔"

یہ ہیں وہ خیالات جو چکبست نے حضرت بشن نرائن در کے متعلق مختلف جگہوں پر ظاہر کئے ہیں۔"

چکبست حضرت اکبر سے اس قدر متاثر تھے کہ زندگی کے ہر حلقہ میں انکے خیالات کی پیروی کرنا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ پنڈت بشن نرائن در مذہب کے معاملات میں بے حد آزاد تھے بلکہ دراصل وہ مذہب کی حد بندیوں کو کچھ اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک انسان کا مذہب یہی ہے کہ وہ دوسرے انسان کا خیال رکھے۔ چکبست اس عقیدہ سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے جا بجا اس کا تذکرہ کیا ہے، ایک شعر میں اپنے مذہب کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو ہے بس اتنا
کہیں گے ہم جس کو پاس انساں، وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے

ایک جگہ چکبست یوں اظہار خیال کرتے ہیں ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ چکبست کا اصل جذبہ اور عقیدہ تھا۔ جو کبھی کلب کی اصلاحی سرگرمیوں کی شکل میں نمایاں ہوتا تو کبھی شعر و ادب کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ ان کا یہ "دردِ دل" کبھی "پاسِ وفا" تو کبھی "جذبۂ ایمان" کی صورت سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

قوم کا سودا، وفا کا شوق خدمت کی اُمنگ
بس اُنھیں دو تین کے صدقے میں دل آباد تھا

چکبست حضرت بشن نرائن درؔ کے خیالات سے اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ اکثر ہندو مذہب پر اعتراضات کرنے لگے تھے چنانچہ ان کے ایک خط کا ترجمہ پنڈت ترلوکی ناتھ کول صاحب نے بہار کشمیر چکبست نمبر میں شائع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوجا پاٹ کی ظاہری رسموں کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر اعتدال سے گذر کر ان کا مذاق بھی اُڑاتے تھے جو ان کی سنجیدہ طبیعت سے کسی قدر بعید معلوم ہوتا ہے۔

سیاست میں بھی وہ پنڈت بشن نرائن درؔ کے پیرو تھے۔ بشن نرائن جی ایک معتدل قسم کے آدمی تھے ان کا خیال تھا کہ ہم انگریزوں کی نگرانی میں ضلع اور صوبہ کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لیں، یہی وجہ ہے کہ جب کانگریس میں گرم دل لوگوں کی اکثریت ہوئی تو حضرت درؔ اس سے الگ ہو گئے۔ برج نرائن چکبست بھی معتدل قسم کے آدمی تھے۔ بشن نرائن درؔ کے بعد گنگا پرشاد ورما کی شخصیت آتی ہے۔ ان کی آزاد خیالی اور سیاست نے بھی ان کو متاثر کیا تھا۔ بابو گنگا پرشاد ورما ایک آزاد مرد قلم تھے۔ چکبست ان کے مرثیے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

قوم کرتی تھی فقط تیری زباں سے فریاد
بحث و تحریک کے میدان میں قلم تھا آزاد

تیرے اخبار دلائیں گے ترے جوش کی یاد
دل کے ٹکڑے ہیں یہی اور یہی تیری اولاد

ہوں خبردار ترا عشق جتانے کے لئے
ان ٹیموں سے ترا نام چلانے کے لئے

آگے چل کر پھر فرماتے ہیں ؎

اپنی آنکھوں میں سمائی ہے تری موت کی رات
سُرگ سے آتے ہیں دیوتا کہ رشی کی ہے وفات

ذات معبود سے ملنے ہی کو ہے تیری ذات
طے ہوا جاتا ہے اک آن میں دریائے نجات

عرش سے فرش پہ ساماں سفر آیا ہے
چاند کشتی لئے گردوں سے اُتر آیا ہے

اَب وہ حضرات آتے ہیں جن کے اثرات سے عام ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں جیسے چکبست بھی متاثر ہوئے۔ ان میں تلک کی شخصیت عجیب و غریب ہے۔ چکبست خود معتدل طبیعت کے آدمی تھے اور چاہتے بھی یہ تھے کہ ہر مقصد بغیر کچھ ہنگامہ پیدا کئے ہوئے حاصل ہو جائے وہ تلک کو ملک اور قوم کا ایک زبردست رہنما مانتے ہیں جیسا کہ خود انھوں نے تلک کے انتقال پر اپنے رسالے "صبحِ امید" میں تحریر فرمایا ہے :-

"دنیا میں اکثر ایسی طوفانی ہستیاں نمودار ہوتی ہیں جنکی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ان کی زندگی میں مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی رفتار و گفتار میں ایک سیلانی کیفیت ہوتی ہے جو کسی قسم کے مقابلے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ انکے معتقد ہوتے ہیں وہ ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اور انکے قول و فعل کو اخلاق اور دانشمندی کا معیار سمجھتے ہیں۔ جو طبقہ انکے خلاف ہوتا ہے وہ انھیں اکثر ناانصافی و خود پرستی کا گنہگار قرار دیتا ہے۔ بال گنگا دھر تلک کی ذات ہندوستان کی پولیٹکل معرکہ آرائی کے میدان میں ایسی ہی زبردست قوت تھی۔ ایک طبقہ ایسے عزیزانِ وطن کا تھا جو اس قدآور قوم کو اپنا پیغمبر و رہنما سمجھتے تھے۔ (کذا) مسٹر تلک کی پرستش انکا ایمان تھا۔ دوسرا فرقہ مسٹر تلک کی وطن پرستی کا قائل تھا اور انکے زبردست قومی خدمات کو ادب و عزت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا مگر ان کا پیرو نہ تھا۔ اکثر اختلاف رائے کے طوفان میں دونوں طرف کے لوگوں کی پُر جوش طبیعت قابو سے باہر ہو جاتی تھی اور مسٹر تلک کی ذات سخت معرکہ آرائی کا مرکز بن جاتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں مسٹر تلک کی عملی پولیٹکل مسلک پر قدم بہ قدم چلنے کا دعویٰ نہیں رہا۔ لیکن ان کی پولیٹکل زندگی کے مردانہ جوہروں سے قومی زندگی کی زینت تھی۔"[ل]

ل رسالہ صبح امید جولائی ۱۹۲۰ء صفحہ ۲ اڈیٹر برج نرائن چکبست پبلشر پنڈت کشن پرشاد کول۔

اس کے علاوہ تلک کا مرثیہ انکے خیالات کا آئینہ ہے، فرماتے ہیں ؎

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار — روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار — طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار
بیکسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

زندگی تیری بہارِ چمنستانِ وفا — آبرو تیرے لئے قوم سے پیمانِ وفا
عاشقِ نامِ وطن، کشتۂ ارمانِ وفا — مرد میدانِ وفا، جسمِ وفا، جانِ وفا
ہو گئی نذرِ وطن ہستیٔ فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

اوجِ ہمت پہ رہا تیری وفا کا خورشید — موت کے خوف پہ غالب ہی رہی خدمت کی امید
بن گیا قید کا فرمان بھی رحمت کا نوید — ہوئے تاریکیٔ زنداں میں ترے بال سپید
پھر رہا ہے میری نظروں میں سراپا تیرا
آہ وہ قیدِ ستم اور بڑھاپا تیرا

اس صورتِ حال کے باوجود چکبست تلک کی اس طوفانی زندگی کے پیرو نہ ہو سکے۔ اور وہ گوپال کرشن گوکھلے اسکول سے متعلق ہو گئے جس کا اظہار "گوکھلے کی تقریریں" کے دیباچہ میں ملتا ہے[۱]۔

"ہندوستان میں اکثر ایسے وطن پرست گذرے ہیں جنکی زبان وقلم کے جوہر یادگار زمانہ ہیں مگر جس فلسفیانہ نظر اور شان مدبّری کا جلوہ گوکھلے مرحوم کی تحریر و تقریر میں نظر آتا ہے۔ اسکی نظیر دوسری جگہ نہ ملے گی۔ گوکھلے مرحوم کے دماغ کا خاص جوہر یہ تھا کہ اس میں عملی زندگی کی معاملہ فہمی کے ساتھ فلسفیانہ دور اندیشی بھی کافی حیثیت سے موجود تھی۔ اس فدائے وطن کی تقریر و تحریر کو پڑھو اور دیکھو کہ مالی اور انتظامی مسائل کے تنگ اور تاریک گوشوں میں بھی اسکے سلجھے ہوئے دماغ کی روشنی چاندنی کیطرح پھیلی ہوئی ہے۔"

ان مسائل پر واضح تر اشارے ان کے مرثیے میں موجود ہیں، فرماتے ہیں ؎

۱۔ دیباچہ از چکبست ۱۹۱۶ء ہندوستان پریس نظیر آباد میں چھپ کر شائع ہوئی

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے — وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آئی ہے پھل پھول اور پتھر سے — زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے

حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
"زمین الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا"

بڑھی ہوئی تھی نحوست زوال پیہم کی — ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی
نگاہ یاس تھی ہندوستاں پہ عالم کی — عجیب شے تھی مگر روشنی ترے دم کی

تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

چکبست ان اثرات کے تحت کانگریس کے قائل اور اس کے مسلک کے پیرو ہے لیکن جب کانگریس کے اندر زیادہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تو بشن نرائن در۔ بابو گنگا پرشاد ورما کے ساتھ یہ بھی کانگریس سے الگ ہو گئے۔ مسز بسنٹ کے خیالات کا بھی ان پر اس قدر اثر ہوا تھا کہ انھوں نے ہوم رول کو ہندوستان کی نجات سمجھ لیا تھا۔ جس کو مکمل طور پر انھوں نے اپنی نظم "ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" میں ظاہر کیا ہے ؎

شیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک — رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک — ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اس خاکِ دل نشیں پر بادل سا چھا رہا ہے — طوفان بیکسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ درد حسرت دنیا سے جا رہا ہے — مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام چکبست کے ان خیالات کا آئینہ ہے کہ جن کو مسز بسنٹ کے نظریات پر اعتقاد تھا، فرماتے ہیں ؎

قوم غافل نہیں مانا تری غمخواری سے — زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
آگ بھڑکی ہے تیری آہ کی چنگاری سے — خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے

دل ترا قوم کے دامن میں دیے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تیری زنداں میں لئے جاتے ہیں

داستاں دین کی دُنیا کو سُنائی تو نے | مذہبی بیر کی دُنیا دمٹائی تو نے
آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بجھائی تو نے | راہ انصاف کی اندھوں کو دکھائی تو نے

کس نے گرتی ہوئی قدموں کو سنبھالا ہوتا
تو نہ ہوتی تو نہ دُنیا میں اُجالا ہوتا

ان اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ چکبست کے دل ودماغ میں مسز بسنٹ کی کیا عزت تھی اور اس کی وجہ کیا تھی۔ دراصل چکبست کے یہاں وطن اور قوم کی محبت کا ایک گہرا جذبہ پایا جاتا ہے جو مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتا ہے چکبست کے زمانے کی سیاست صرف یہ تھی کہ ہندوستانی عوام کو میونسپلٹی کے الیکشن میں حصّہ لینا ہوتا تھا۔ چکبست کا خیال تھا کہ ہوم رول ہی ملک کی اس برباد حالت کو بدل سکتا ہے۔ وہ سیاسی خیالات میں خواہ کسی انسان سے کتنے ہی مختلف الرائے ہوں لیکن اگر اس کے یہاں حب الوطنی کا جذبہ موجود ہے تو چکبست صرف اس ایک جذبہ کی وجہ سے اس کی قدر کرنا اپنا فرض تصوّر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمکو "صبح وطن" میں زیادہ تر حب وطن کے نغمے یا ان حضرات کے مرثیے ملتے ہیں جو وطن پر جان دیتے تھے۔

پنڈت بشن نرائن ڈر نے دوران قیام ولایت میں قانون کے ساتھ ہی فلسفے کو بھی پڑھا تھا۔ انکے اثر سے چکبست نے تمام مغربی مفکّروں کو خاص طور پر پڑھا اور انکو سمجھنے کی کوشش کی۔ اُردو ادب میں چکبست نے آتش، غالب اور انیس کو بکثرت پڑھا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کے اثرات چکبست کی شاعری میں پوری طرح سے نمایاں ہیں۔ خاص طور پر اگر ہم چکبست کے نوحوں کو پڑھتے ہیں تو ہر ہر قدم پر میر انیس کی پیروی ملتی ہے۔

چکبست مرحوم نے اپنی قوم کی بربادی اور خرابیوں کو جس طرح دُور کرنے کی کوشش کی ہے اس کی مثال شاید ہی کشمیری پنڈتوں میں موجود ہو۔ ۱۸۵۷ء کے اثرات کشمیری پنڈتوں پر بھی اسقدر شدید پڑے کہ وہ لوگ اپنے تمام علم وادب کو قبول کر گمراہی اور بداخلاقی میں مبتلا ہو گئے۔ جس طرح سے سر سید احمد خاں مرحوم مسلم

قوم کو اس کی برباد حالت سے نکال کر بلندی پر لائے اسی طرح چکبست نے کشمیری پنڈتوں کی اصلاح کی کوشش کی۔

چکبست نے اس مقصد کے لئے ۱۹۰۴ء میں ایک کلب "کشمیری ینگ من ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کیا اور ساتھ ہی ایک لائبریری "بہار لائبریری" قائم کی۔ کلب میں روزانہ شام کو سب ممبر جمع ہوتے، اخبارات پڑھے جاتے۔ اگر کسی ممبر کو کوئی مشکل درپیش ہوتی تو اس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ہر ممبر کے دن بھر کے کام کا جائزہ لیا جاتا۔ تمام خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ہر ہفتہ ایک جلسہ ہوا کرتا تھا۔ جس کے لئے کوئی مضمون پہلے سے طے کر لیا جاتا تھا۔ اس پر ممبران تقریر کرتے، جس سے ممبران کو تقریر کرنا آتا۔ اور وہ اپنے خیالات مختلف مسائل پر مختلف پہلوؤں پر ظاہر کر سکتے تھے۔ چکبست خود کلب میں بیٹھتے اور تمام کاروائی ان کے سامنے ہوتی۔ وہ خود ہر ممبر کو تربیت دینے اور اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے۔

چکبست کی یہ اصلاح صرف روزانہ کی زندگی تک ہی محدود نہ رہی بلکہ انھوں نے کشمیری پنڈتوں کی زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کرنی چاہی۔ شروع شروع میں بزرگوں نے بھی ان کی مدد اور ہمت افزائی کی۔ لیکن جب انھوں نے مذہبی اصلاح شروع کی تو ان بزرگوں نے مخالفت شروع کر دی۔ کشمیری پنڈت ایک یگ "رشی پیر" کے نام پر منایا کرتے تھے سال بھر چندہ جمع ہوتا اور یگ کے دن ناچ گانا ہوتا۔ اور شراب و کباب کی محفل رات بھر گرم رہتی۔ چکبست ان خرابیوں سے متاثر ہوئے اور انھوں نے کلب کے ممبران کو اس یگ کے خلاف تیار کیا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۵ء میں پیش آیا۔ اس وقت سے بعض بزرگ پنڈت کلب کے سخت مخالف ہو گئے۔ لیکن چکبست نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی، اور نہ اس کا کچھ اثر کلب پر ہوا جس کی مفصل بحث آگے کے باب میں آئے گی۔

چکبست نہایت آزاد مزاج انسان تھے۔ وہ تعصب سے الگ تھے۔ اور یہ انکی بڑی خواہش تھی کہ آدمی آدمی کو انسان کی حیثیت سے دیکھے، بجائے اس کے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان، اسکے علاوہ انکی زندگی جذبۂ حب وطن سے سرشار تھی جس کا ثبوت

ان کا دیوان "صبح وطن" اور ان کا ادبی رسالہ "صبح امید" ہے۔ جس کو انھوں نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جاری کیا تھا۔ یہ دونوں کارنامے وطن سے انکی محبت کا آئینہ ہیں
رسالہ "صبح امید" کے اجرا کا مقصد بھی اصلاحی تھا جس کے ذریعہ سے وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہونچانا چاہتے تھے۔ اور ساتھ ہی اپنے ادبی ذوق کو بھی پورا کرنا چاہتے تھے۔ یہ پرچہ قریب تین سال تک نکلا۔ آخر میں جب وکالت کی مصروفیت نے چکبست کو مجبور کر دیا تب انھیں یہ پرچہ بند کرنا پڑا۔

چکبست نوجوانوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی ترقی دینا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ لڑکیاں صرف گھر کے کام کریں بلکہ چکبست ان کی تعلیم کے قائل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ لڑکیاں ضرورت سے زیادہ آزاد ہوں جس کا مکمل اظہار ان کی نظم "پھول مالا" میں ملتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لڑکیاں چند دنوں میں وہ اہم کام انجام دیں گی جس پر آئندہ ہندوستان کی ترقی کا دارومدار ہے۔ یعنی ماں بن کر انکے فرائض کیا ہو جائینگے اسکے علاوہ چکبست بیوہ کی دوبارہ شادی کرانا چاہتے تھے۔ اس پر بھی ان کی ایک نظم برق اصلاح موجود ہے۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی کشمیری بیوہ کی شادی ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں ایک زبردست بحث شروع ہوئی جس کا مکمل اظہار آگے کے باب میں آئے گا۔

یہ تھی ایک اس شخص کی زندگی جس کے پیرو جسکے ساتھی، جسکے چھوٹے اسے "گرودیو" یا اپنا رہبر مانتے تھے لیکن افسوس زندگی نے وفا نہ کی۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء جمعہ کے دن وہ رائے بریلی علی الدین صاحب بیرسٹر کے مقدمے میں تشریف لے گئے۔ قریب دس بجے مقدمہ شروع ہوا کیل کا(؟) صاحب جو اس وقت وہاں سب جج تھے انکے سامنے ایک بجے تک بحث کرنے کے بعد اسٹیشن آئے۔ محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ جو دوسری جانب کے وکیل تھے ساتھ ہی آئے۔ ان کا کہنا ہے کہ قریب دو بجے گاڑی آئی۔ اس میں سوار ہو کر سب لوگوں نے چائے منگائی۔ جیسے ہی چکبست صاحب چائے کی پیالی منھ کے قریب لے گئے۔ ایک دم سے ان کی زبان پلٹ گئی۔ اور عجیب کیفیت ہونے لگی۔ ایوب صاحب اور علی الدین صاحب نے ان کو لٹا دیا اور فوراً ہی ڈاکٹر کو

بُلایا۔ جب تک ڈاکٹر آئے اس وقت تک کے لئے گاڑی سے اُتار کر انکو ویٹنگ روم میں لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا اور سیدھی طرف فالج کا اثر بتایا۔ لکھنؤ ان کے بڑے بھائی کو فون کیا گیا، جو قریب سات بجے کے رائے بریلی پہونچے۔ لیکن جیسے ہی انھوں نے کمرہ میں قدم رکھا، برج نرائن چکبست نے آخری سانس لی، یہ تھی اس محبِ وطن، ادب نواز اور معلم اخلاق کی موت۔ لاش گیارہ بجے رات کو موٹر سے لکھنؤ لائی گئی۔ دوسرے دن تمام کچہریاں بند رہیں، گیارہ بجے دن کو میت اُٹھائی گئی اور دریائے گومتی کے کنارے آخری رسوم ادا کیے گئے۔

تمام رسالوں، اخباروں میں انکے اس طرح سے انتقال کر جانے کا حال شائع ہوا۔ لوگوں نے قطعات تاریخ کہے اور وفات کی تاریخیں نکالیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہور تاریخ جناب کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے نکالی ہے ۔

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراز "عزا" (۷۸)
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

۶۶ ۱۲ ۷۸ = ۱۳۴۴

دیوان رادھے ناتھ کول گلشن کو چکبست سے جو محبت تھی وہ ان کے ذیل کے قطعہ سے نمایاں ہو رہی ہے ۔

حقیقت کھل گئی دنیا کی گلشن آج ہر دل پر — کہ جو کچھ دیکھتے ہیں سب یہ ہے اک خواب بیداری
ابھی چکبست اسٹیشن پہ تھے رائے بریلی کے — تھی واپس لکھنؤ جانے کی پوری انکی تیاری
کہ قزاقِ اجل نے آن لوٹا اس مسافر کو — ہوئی فالج کے سر جاں قبض کرنے کی گنہگاری

وقوعہ ہے سن چھبیس (۱۹۲۶) بارہ (۱۲) فروری کا یہ — کہ ٹوٹا کوہِ غم یکبخت ملک و قوم پر بھاری
بہائے آٹھ آٹھ آنسو جو انکی لاش پر سب نے — جب آئی یاد دلمیں اسکی دلداری و غمخواری
وکالت گرچہ پیشہ تھا سخن کے تھے مگر ماہر — وہ تھے خوش خلق رکھتے تھے جدا اپنی وضعداری

گئے دنیا سے اے چکبست تم کیا ہم تو کہتے ہیں
گئی صحبت سخن کی آہ رونق بزم کی ساری

سمت ۱۹۸۳ بکرمی

حضرت ندیم ہندی کا قطعہ بھی اہم ہے فرماتے ہیں ؎

اس جوانی میں یوں چلے جانا — آہ چکبست کیا ستم ڈھایا
صبح اٹھے تو یہ خبر پائی — لاشہ تیرا ہے لکھنؤ آیا
ایک سناٹا چھا گیا سن کر — دل یقیں مطلقاً نہیں لایا
تیر تھا اک جگر کے پار ہوا — بے قراری نے خوب تڑپایا
فلک شاعری کا تھا اک ماہ — ادب اس نور کا تھا اک سایا
زورِ علم و ادب یہ طبع میں تھا — جو چڑھا منہ تیرے وہ شرمایا
وہ سماں کچھ دنوں بھی اف نہ رہا — دے کے غم چرخ تو نے کیا پایا
ہم سے چھینا ہے اک رفیق شفیق — یہ ستم دہر کیوں تجھے بھایا
اقربا اور دوستوں پہ ترے — تیرہ و تار ابر غم چھایا
غم نے مادر کے اور بیوہ کے — آہ قلب و جگر کو برمایا
دختر خرد سال نے تیز ہی — آنسو پی پی کے تیر غم کھایا
گلشنِ قوم کا گلِ تر تھا — آہ کھلتے ہی کیسا مرجھایا
مجھ سے تھا تجھ کو اک خلوص قدیم — جس سے پھرتا تھا میں بھی اترایا
غم کے طوفان کا وہ زور بندھا — مطلع دل تمام گردایا
دیکھا آنکھوں نے وہ سماں افسوس — جو مقدر نے ان کو دکھلایا
تیری فرقت میں اس ندیم نے بھی — رنج و اندوہ غم کو اپنایا
سال تاریخ کی ہوئی جب فکر — دل غمگیں بہت ہی گھبرایا

"غم چکبست برگزیدۂ دہر"
۴۵۷ ۱۵۲۵

کہدے ہاتف نے مجھ سے فرمایا — سمت ۱۹۸۲ بکرمی

جناب مہابیر پرشاد صاحب کیفی نے چکبست کی موت کا جو دردناک منظر پیش کیا ہے وہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں ؎

دل دکھے دل سے وہ ہرگز مدعائے دل نہیں — نالۂ دل کی حقیقت کچھ سوائے دل نہیں
یہ بیاں جوش غم فرما مرا اے دل نہیں — دل امڈ آئے یہ سن کر یہ خطائے دل نہیں

جنبشِ فطرت ہے فریاد و بقا کے واسطے
یہ صدائے سوز ہے ساز و وفا کے واسطے

اُٹھ گیا وہ دوست جو ہمدرد اور غمخوار تھا
دل وہ افسردہ ہوا جو واقفِ اسرار تھا

پھول مرجھایا ہے وہ جو زینتِ گلزار تھا
شاخ وہ ٹوٹی ہے جس پر سیکڑوں من بار تھا

موت نے مہلت نہ دی بستر سے ہلنے کے لئے
موت نے فرصت نہ دی بھائی سے ملنے کے لئے

کس طرح اے دوست یہ صدمہ اُٹھایا جائیگا
کس کو اب آواز دینگے دل اگر گھبرائے گا

کون یوں حالِ خراب قوم اب سمجھائے گا
نالۂ دردِ وطن سے کون دل برمائے گا

کس کے دم سے قوم سرفروشی پائے گی
کس کے نغموں سے صدائے ہوم رول آئے گی

وہ نظر گہری کہ چشمِ فلسفی کو رشک آئے
ذہن وہ سلجھا کہ رازِ ہستیٔ عالم بتائے

دل میں درد اتنا کہ پہروں خون کے آنسو رلائے
روح پاک ایسی کہ شاید جسکو ہر انسان پلئے

طبعِ موزوں پہ رہا قابو سخن کے ساتھ ساتھ
شاعری بھی جاگ اُٹھی حبِ وطن کے ساتھ ساتھ

چکبست کے کردار کو سمجھنے کے لئے ان کے ایک شعر کو سامنے رکھنا پڑتا ہے جو ان کی زندگی کا آئینہ ہے کہتے ہیں ؎

قوم کا سودا وفا کا شوق خدمت کی اُمنگ
بس انھیں دو تین کے صدقے میں دل آباد ہے

چکبست کی حیات "قوم کا سودا۔ خدمت کی اُمنگ۔ وفا کا شوق" کی سعی و عمل کی محرک تھی چکبست نہایت نیک طبیعت خوش اخلاق انسان دوست اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔ وہ جن حضرات سے ملتے تھے نہایت خلوص اور سچے دل کے ساتھ ملتے تھے۔ انھوں نے تمام عمر کسی کو نقصان پہونچانا نہیں چاہا بلکہ جیسا کہ خود انھوں نے مباحثۂ گلزارِ نسیم کے متعلق ایک مضمون میں تحریر فرمایا ہے :۔

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے قلم سے ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلے گا جس سے کسی بندۂ خدا کی توہین ہو۔"

ے آدب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنی وادی کا
نہیں ممکن کہ گرد اڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر

چکبست تمام عمر ان خیالات پر پابندی سے کاربند رہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال پر ان کے تمام ملنے والے ان کے ذاتی اوصاف اور اخلاق کو یاد کرتے تھے۔ تربوکی ناتھ کول صاحب فرماتے ہیں[1]۔

"چکبست کے ذاتی صفات و اخلاق، سادگی مزاج اور خلقی انکسار نے اپنے وسیع دائرہ میں صدہا احباب و بہی خواہان کو جمع کر لیا تھا گویا ایک سحر تھا کہ سب کے دلوں کو تسخیر کئے ہوئے تھا۔ مرحوم کا مسلک وہ تھا جو ایک شعر میں ظاہر کرتے ہیں ے

محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو
جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو"

چکبست کی آزاد خیالی حق بات کرنے اور ایثار و مروت کو یاد کرتے ہوئے وصل بلگرامی نے ایک قطعہ تحریر فرمایا ہے جس کے چند اشعار ان کی حیات پر روشنی ڈالتے ہیں[2]۔

جو تھا غم خوردہ آزادِ وطن وہ چکبست — جو تھا آماجگاہ رنج و محن وہ چکبست
جس کو حق بات کے کہنے میں کبھی باک نہ تھا — جو تھا وارفتۂ زنجیر و رسن وہ چکبست
جسکے رگ رگ میں محبت کی بھری تھی بجلی — جو تھا ایثار و مروت ہمہ تن وہ چکبست
جسکی آزاد خیالی کا زمانہ تھا اسیر — جس نے سلجھائے تھے گیسوئے پریشان ادب

چکبست مرحوم کی شرافت سکندر علی وجد کو بھی متاثر کئے ہوئے تھی جو اپنے جذبات کو ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں[3] ے

مخلص تھا جان و مال کی پروانہ کی کبھی — دشمن کی بے بسی بھی گوارا نہ کی کبھی
صدمے سہے شکایت دنیا نہ کی کبھی — زخمی ہوا تو فکرِ مداوا نہ کی کبھی

---

[1] رسالہ بہار کشمیر لاہور صفحہ ۱۴ ار فروری ۱۹۳۹ء
[2] یاد چکبست مرتب آنند نرائن ملا صفحہ ۲۵ ۱۹۳۹ء
[3] یاد چکبست مرتب آنند نرائن ملا صفحہ ۸۱ ۱۹۳۹ء

نکلا جو دل کے داغ دکھانے کے واسطے
گویا بنا تھا رنج اٹھانے کے واسطے

لیکن ان تمام اشعار سے زیادہ اہم اور صاف وہ قطعہ ہے جو لسان القوم حضرت مولانا صفی صاحب مرحوم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اس میں چکبست کی شاعری اور زندگی دونوں کی ہو بہو تصویر مرحوم نے پیش کر دی ہے۔

اسقدر ہم نے اٹھائے غمِ احباب کے داغ
دل میں طاقت نہ رہی آہ و بکا کی افسوس

شمعِ بزمِ شعرا برج نرائن چکبست
ہو فاعمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس

داغ فرقت سے تمھارے ادبِ اردو پر
دیر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس

شورِ ماتم ہے بپا حلقۂ احباب میں آج
شان اس بزم میں ہے بزمِ عزا کی افسوس

ہائے بیتابیٔ دل اور وہ بے تابیٔ دل
جب زباں بند ہوا ک نکتہ سرا کی افسوس

چارہ جویوں کے دلوں میں یہ حسرت ہی رہی
ملی مہلت نہ دوا کی نہ دعا کی افسوس

سفرِ مختصر اے دوست تمھارا کیا تھا
ابتدا تھی سفرِ ملک بقا کی افسوس

قطع کی یکہ و تنہا رہِ پُر خوفِ عدم
دست کش ہو گئے فاقت سے عصا کی افسوس

اے گلِ سرسبدِ گلشنِ کشمیر تجھے
راس آئی نہ ہوا دارِ فنا کی افسوس

ادبی ماحول

دلی کی تباہی نے اربابِ علم و فضل کو مجبور کیا کہ وہ وطن کو خیرباد کہیں دلی سے باہر دو مقام ایسے تھے جنھیں ان کم نصیبوں نے اپنے لئے جائے پناہ تصور کیا۔ ایک فرخ آباد دوسرا فیض آباد۔ فیض آباد میں نواب وزیر شجاع الدولہ کی حکومت تھی۔ نواب مؤتمن الدولہ۔ محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی امۃ الزہرا بیگم کے ساتھ نواب کی شادی نے ان کو دہلی سے اور قریب کر دیا تھا۔ کیونکہ امۃ الزہرا بیگم محمد شاہ بادشاہ دہلی کی منھ بولی بیٹی تھیں۔ اس کے علاوہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام اودھ نے دہلی والوں کے لئے اودھ میں ایک معزز جائے قیام پیدا کر دی تھی جس نے دلی سے منھ موڑا اس نے سیدھا اودھ کا رخ کیا۔

علامہ سراج الدین علی خاں آرزو اور میر غلام حسین ضاحک فیض آباد آئے۔ میر سوز اور مرزا رفیع سودا بھی فرخ آباد ہوتے ہوئے فیض آباد پہونچے[۵۱]۔ جب نواب آصف الدولہ بہادر نے اپنا پایہ تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو سوز۔ سودا اور میر ضاحک کے لڑکے اور پوتے میر حسن اور خلیق ان کے ہمراہ لکھنؤ آبسے[۵۲]۔ اب دلی کے بچے کھچے شعراء بھی لکھنؤ سے متاثر ہو ہو کر ادھر کھنچنے لگے۔ میر تقی میر نے دلی کو خیرباد کہا۔ شیخ مصحفی۔ میر ولی اللہ محب۔ میر غلام حسین برشتہ۔ میر انشاء اللہ خاں انشاء۔ جرأت۔ مرزا قتیل اور محمد صادق اختر بھی لکھنؤ کو اپنانے کے لئے مجبور ہو گئے[۵۳]۔ غرض کہ دلی کا شیرازہ بکھرا اور لکھنؤ پھر سے آباد ہوا۔ اب لکھنؤ دلی کا نمونہ تھا۔ لکھنؤ کے کوچہ و بازار شاعروں کی آواز سے گونج اٹھے۔ گھر گھر شعر و شاعری کے چرچے تھے۔

اس دور کا لکھنؤ دراصل دلی کا چربہ تھا۔ ہاں فرق صرف یہ تھا کہ لکھنؤ میں

---

۵۱ لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۵۲ لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۵۳ لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

عیش و عشرت اور اطمینان تھا جس کا دلی میں فقدان تھا۔ دلی کے شعراء لکھنؤ کی شاعری کو اپنے رنگ میں ڈھالنا چاہتے تھے جس میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ لکھنؤ کے سکون اور امن نے خود ان کی شاعری پر اثر ڈالا۔ لکھنؤ میں تصوّف کی کمی تھی شاید ان کی وجہ یہ ہو کہ تصوّف مایوسی کا فلسفہ ہے۔ اور لکھنؤ کی زندگی مایوسی سے کوسوں دُور تھی یہ تو دلی کی زندگی تھی کہ ناکامی کے بعد ناکامی نے شعراء کو مجبور کردیا تھا کہ وہ تصوّف کے فلسفہ کو پیشِ نظر رکھ کر شعر و شاعری کریں۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب تحریر فرماتے ہیں[۵۱]:۔

"لکھنؤ کا سب سے بڑا کارنامہ یہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس نے شاعری کو نیم تصوّف اور مغموم داخلیت کے محدود دائرہ سے نکال کر وسیع تر فضا میں سانس لینے کا موقع دیا۔"

دراصل یہ دلی کی تباہی تھی جس نے شعراء کے دماغ کو اس طرف رجوع کیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب اپنے تحقیقی مقالے میں اسکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۵۲]:۔

"ان لوگوں (دلی کے شعراء) نے اُردو شاعری میں ایک نیا مضمون داخل کیا جو شعرائے دکھن کے یہاں موجود نہیں۔ یہ تصوّف ہے۔ شاعری نے دکھن میں چونکہ سلاطین کے زیرِ سایہ پرورش پائی اور دکھنی سلاطین زیادہ تر اثنا عشری تھے اسلئے دکھنی شعراء نے ان مضامین کی طرف رُخ نہیں کیا۔"

درحقیقت دکھن کے شعراء کو تو کبھی اس بربادی یا تباہی کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس سے متاثر ہو کر دلی والے زندگی کو دوسری نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ اب شعراء کو جو ذرا سا سکون ملا تو انھوں نے دیگر اصنافِ سخن میں بھی فکر آزمائی شروع کردی۔ مرثیہ۔ مثنوی کی ترقی ہوئی۔ قصیدہ کے ساتھ ہجو گوئی پر بھی زبان کھلی۔ غزل کا دائرہ بھی وسیع تر ہوگیا۔ کیونکہ اب وقت کی کمی کا احساس ختم ہوچکا تھا۔ شاعری سے نواب آصف الدولہ کی دلچسپی اور محبّت نے لکھنؤ کو شعر و ادب کا مرکز بنا دیا تھا۔ اب عیش و

---

۵۱ کتاب ادبی تنقید مضمون "۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ کا اُردو ادب" صفحہ ۱۸۹ شائع کردہ ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ ۱۹۵۴ء

۵۲ لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۵۳ از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

نشاط کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ نواب کی دریا دلی نے شعر و ادب کا نقشہ بدل دیا۔ حسرت اور جرأت نے معاملہ بندی اور مادی عشق کی مختلف شکلیں پیش کرنی شروع کر دیں۔ عوام بھی ان اثرات سے الگ نہ رہ سکے۔ ان کو سوز و گداز جذباتی خلوص سے زیادہ شوخی۔ رندی اور بیان کی چاشنی سے رغبت ہو گئی۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان چیزوں نے ہمارے شعرا کو اب "الفاظ کی ماہیت طرز بیان کی قوت اور زبان کی قدر و قیمت کی طرف مائل کیا۔"

نواب آصف الدولہ کے زمانہ سے مرثیہ کا باقاعدہ عروج ہوتا ہے۔ قصیدہ زوال پذیر ہوا۔ نواب آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں۔ غازی الدین حیدر۔ نصیر الدین حیدر، ان حضرات کے زمانہ میں اُردو شاعری تین حصّوں میں تقسیم ہوئی۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ غزل۔

مثنوی:۔ لکھنؤ میں مثنوی کے انداز پر بھی بہت کچھ لکھا گیا، مثلاً گلزار نسیم۔ فسانۂ عشق۔ حزن اختر۔ زہر عشق۔ بہار عشق۔ فریب عشق۔ عالم خیال۔ اور امید و بیم چند مشہور مثنویاں ہیں۔ چکبست نے چونکہ کوئی مثنوی نہیں لکھی، اس لئے صنف مثنوی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

یوں تو اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ مرثیہ کی ابتدا ہوئی ہے لیکن اس کو صرف مذہبی فرض تصوّر کر کے لکھا جاتا رہا۔ گجرات اور دکھن کے مرثیہ گو شاعروں کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی مرثیہ گو پائے جاتے ہیں۔ دکھنی مرثیے شمالی ہندوستان میں اُردو شاعری سے قبل پہونچ چکے تھے جیسا کہ شیخ چاند قائم کے تذکرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[۱]

"چنانچہ قائم کے ذیل کے بیان سے معلوم ہوتا کہ ۱۱۱۶ھ سے قبل (عہد اورنگ زیب میں) دکھنی مرثیے کے ساتھ ساتھ دکن سے شمالی ہند پہونچے تھے قائم نے شاہ قلی خاں شاہی مصاحب و ندیم تاناشاہ کے ضمن میں لکھا ہے:۔
سابق بریں پنجاہ سال ابیات و مرثیہ اش در بلاد ہندوستان دست بدست گردیدہ اند"

۱؎ سودا از شیخ چاند صفحہ ۲۸۲ ناشر انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

عہد محمد شاہ (جب باقاعدہ اُردو شاعری کی شمالی ہند میں ابتدا ہوئی ہے) سے قبل شمالی ہند میں باقاعدہ مرثیہ گوئی کا رواج نہ تھا۔ شیخ چاند نے اس دور کے تین شعرا کا ذکر کیا جن کے اسمائے گرامی مسکین ۔ حزیں و غمگین ہیں۔ اسکے بعد ہم کو سودا کے ہم عصر شعرا میں کئی مرثیہ گو نظر آتے ہیں ۔ مرزا علی قلی ندیم شاہجہانپوری اور محمد تقی۔ میر علی علی ۔ میر امانی ۔ سید محمد تقی ۔ سکندر ۔ صبر ۔ گمان ۔ میر حسن کے علاوہ اور بھی شعرا ہیں جن کا تذکرہ میر حسن، تذکرہ مصحفی وغیرہ میں ملتا ہے۔

لیکن اب تک مرثیہ گوئی ادب کا جزو نہیں سمجھی جاتی تھی۔ سودا نے سب سے پہلے اس انداز میں اس طرف رجوع کیا۔ انھوں نے مرثیہ کی صورت کو بڑی حد تک تکمیل کے راستہ پر لگایا جس کا ذکر شیخ چاند فرماتے ہیں[1] :-

"سودا سے قبل مرثیہ گوئی کی صورت صرف مربع تک محدود تھی۔ مرثیے یا تو غزل نما (منفردہ) ہوتے تھے یا مربع دوسری کسی صورت میں نہ ہوتے تھے۔ بحریں بھی عموماً آسان اور مترنم ہوتی تھیں بعض شعرا نے مشکل بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے ...... لیکن ایسے بہت کم تھے ....

سودا کا مرثیہ گوئی میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کی کئی صورتیں پیدا کر دیں۔ چنانچہ اس کے مرثیے ذیل کی صورتوں میں ملتے ہیں :-

(۱) منفردہ (۲) مستزاد منفردہ (۳) مثلث (۴) مثلث مستزاد

(۵) مربع (۶) مربع مستزاد (۷) مخمس ترکیب بند (۸) مخمس ترجیع بند

(۹) مسدس (۱۰) مسدس ترکیب بند (۱۱) دہرہ بند

سودا کا یہ بہت بڑا کام ہے کہ اس نے مرثیہ گوئی کی جولانگاہ کو وسیع تر کر دیا اور اظہار مطالب و مضامین کی کئی راہیں کھول دیں۔"

انھوں نے اس کی معنوی حیثیت کے بنانے میں کوئی خاص قدم نہیں اُٹھایا لیکن مرثیہ کی اصل ترقی جس نے اس کو ادب کا ایک جزو عظم بنا دیا سلطنت اودھ کے زمانہ میں ہوئی۔ بادشاہ اودھ شیعہ ہونے کی وجہ سے خود بھی مرثیہ کہتے تھے اور انھوں نے مرثیہ گو شعراء کی سرپرستی کر کے اس صنف شاعری کو اس قدر ترقی دی

---

[1] سودا از شیخ چاند صفحہ ۲۹۰ ناشر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

کہ مرثیہ اُردو شاعری کا اہم جزو ہو گیا ہے۔ خاندان میر حسن کے سر پر اس کا سہرا باندھا جانا چاہیئے جنھوں نے مرثیہ کی طرف خاص طور پر متوجہ ہو کر اسکو ترقی دی۔

ضمیرؔ نے کلام میں زور۔ بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی۔ ابتک مرثیے سوز کی صورت میں پڑھے جاتے تھے۔ میر مستحسن خلیق نے مرثیہ کو مسدس کی شکل میں لکھنا شروع کر دیا اور اس کو اس حد تک ترقی دی کہ آج تک عموماً مرثیے مسدس ہی کی شکل میں لکھے جاتے ہیں۔ مرثیہ میں اور تمام مضامین بھی شامل کئے جانے لگے۔ خلیق نے صفائی زبان اور صحت محاورہ کا بے حد خیال رکھا اور اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تشبیہات، استعارات اور لفظی مناسبت کو بھی ترقی دی۔ ان بزرگوں نے رزم۔ بزم اور سراپا کی مکمل تصویریں ہمارے سامنے پیش کی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام کے محاسن کی بنیادیں خلیقؔ اور ضمیرؔ نے رکھیں اور ان کو انیسؔ اور دبیرؔ نے ترقی دے کر معراج کمال پر پہونچا دیا۔ نئی تشبیہات لطیف استعارات۔ مبالغہ۔ واقعہ نگاری۔ کردار نگاری۔ مناظر قدرت کی تصویریں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام کے محاسن ہیں لیکن یہ چیزیں ہم کو ضمیرؔ اور خلیقؔ کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔

ان بزرگوں کے شاگردوں میں اب ان کی آمد آمد ہے جنھوں نے مرثیہ کو واقعی مرثیہ ہی نہیں بنا دیا بلکہ رزمیہ اور بیانیہ شاعری کو مکمل کر دیا جس کی کمی انگریزی داں طبقہ محسوس کر رہا تھا۔ یہ بزرگ میر ببر علی انیسؔ اور مرزا دبیرؔ ہیں۔

میر انیسؔ نے نئے نئے اسلوب اُردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیئے ایک ہی واقعہ کو سیکڑوں طرح سے بیان کر دیا اور ایسا انداز بیان اختیار کیا کہ پڑھنے والا اسی ایک واقعہ کو ہر مرتبہ نیا واقعہ سمجھنے لگا۔ بقول مولانا آزاد[۱]۔

"شاہنامہ کے ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔ انھوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیئے۔ ایک مقررہ مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرتبہ چہرہ نیا۔ آمد نئی۔ رزم نئی بزم نئی، اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا۔ تلوار نئی۔ نیزہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔

---

[۱] آب حیات

مقابلہ کیا اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ۔ رات کی رخصت۔ سیاہی کا چھٹنا۔ نور کا ظہور۔ آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام ہے تو شام غریباں کی اُداسی۔ کبھی رات کا سناٹا۔ کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے غرض جس حالت کو لیا ہے اس کا سماں باندھ دیا ہے۔"

میر صاحب مرحوم نے زبان کی بے حد خدمت انجام دی۔ ساتھ ہی انھوں نے اُردو ادب کی اس کمی کو بڑی حد تک پورا کیا جو رزمیہ شاعری کہلاتی ہے۔ اُردو ادب میں ابتک کوئی ایسی نظم نہیں موجود تھی جو ہومر کی الیڈ و رجل کی اینڈ۔ ویاس کی مہابھارت والمیک کی راماین یا فردوسی کے شاہنامہ کے مقابلہ میں رکھی جاسکتی۔ اس کمی کو پورا کرنے کا سہرا مرثیہ کے سر ہے اور مرثیہ کو معراج کمال تک پہنچانے کا سہرا انیس اور خاندان انیس کے سر ہے۔

میر انیس کے ہمعصر اور ہم پلہ شاعر میرزا دبیر نے بھی مرثیہ کی بڑی خدمت کی۔ بقول سید عبدالحئی صاحب[۱]:-

"مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات استعارات ہیں۔ یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں۔ بقول شبلی۔ خیال آفرینی۔ دقت پسندی۔ جدتِ استعارات۔ اختراعِ تشبیہات۔ شاعرانہ استدلال۔ شدتِ مبالغہ میں ان کا جواب نہیں۔"

میرزا دبیر نے مرثیے میں آیات قرآنی۔ نئی تشبیہات اور اعلےٰ تخیل کا استعمال کر کے اس کو بے حد وسعت دی ہے۔ پرشکوہ الفاظ کے استعمال کا بھی انھیں شوق تھا اور اس کو انھوں نے اس طرح سے مرثیہ میں صرف کیا ہے کہ ان الفاظ کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ غضب کی ذہانت کے مالک ہونے کی وجہ سے انھوں نے مرثیہ کو بے حد ترقی دی۔

میر انیس کے دوسرے بھائی میر مونس گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے کے باوجود

---

[۱] گل رعنا۔ از مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب صفحہ ۲۹۹ مطبع معارف اعظم گڈھ طبع سوم ۱۳۶۴ھ

مرثیہ بھی تصنیف کرتے تھے۔ میر صاحب کے تیسرے بھائی میر انس تھے ان کو بھی مرثیہ لکھنے کا شوق تھا۔

میر انیس کے تینوں لڑکوں میں سے میر نفیس زیادہ مشہور ہیں انھوں نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر مرثیوں کے حسن بیان میں اضافہ کیا۔ نفیس کے ایک صاحبزادے دولھا صاحب عروج گزرے ہیں لیکن ان کے نواسے عارف صاحب نے اپنے نانا نفیس کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کر کے خوب مرثیے لکھے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے ہم عصروں میں میر عشق ایک اور مرثیہ گو تھے انکے بھائی تعشق غزل اور مرثیہ دونوں کہتے تھے۔ مرثیہ میں نزاکت خیال اور تاثیر ہوتی تھی۔ ان کے بیٹے صابر کو شہرت اپنے بیٹے پیارے صاحب رشید کیوجہ سے ہوئی۔ پیارے صاحب رشید نے مرثیہ کو اپنے مخصوص انداز میں ترقی دی۔ ان کی توجہ زیادہ تر زبان پر رہی۔

مرثیہ نگاروں کا یہ سلسلہ آج تک قائم ہے اس نے اُردو ادب کو بے حد فائدہ پہونچایا۔ اُردو شاعری میں اب تک رزم۔ بزم۔ اور منظر نگاری وغیرہ کا پتہ نہ تھا۔ مرثیہ کی وجہ سے اُردو ادب میں یہ داخل ہوگئی۔ مرثیہ نے اس میں مختلف قسم کے مضامین کا اضافہ کیا۔ مرثیہ گویوں نے مسدس کو جس میں مرثیہ لکھا جانے لگا تھا۔ اس قدر ترقی دی کہ پر جوش نیچرل نظموں کو لکھنے کے وقت حالی وغیرہ نے مسدس ہی کو پسند کیا۔ بقول رام بابو سکسینہ[1]:۔

"اگر غور سے دیکھئے تو آزاد۔ حالی اور سرور وغیرہ کی دلچسپ اور زوردار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چین اور رہین منت ہیں۔ مثلاً تمہید یتسلسل بیان۔ اعلیٰ جذبات کا اظہار۔ سلاست زبان۔ تشبیہات، تخیل وغیرہ جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں، سب قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے استاد اب سے بیشتر نہایت کامیابی سے برت چکے ہیں"۔

آج ہماری شاعری بالخصوص اُردو غزل پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ہم ان کے جواب میں صرف اپنے تمام اصناف سخن میں سے صرف مرثیہ کو بیش

---

[1] تاریخ ادب اُردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری صفحہ ۲۸۲ مطبع نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۲۹ء

کر سکتے ہیں۔ درصل مرثیہ کی ابتدا سے ہمارے یہاں ایک طرح سے اصلاحی شاعری کا آغاز۔ حسن و عشق مبالغہ غیر حقیقی اور غیر فطری شاعری کے بجائے حقیقی۔ جذباتی اور فطری شاعری کی ابتدا مرثیہ کی ابتدا ہے۔ مضامین کے اعتبار سے مرثیہ بے حد سنجیدہ۔ اخلاق آموز۔ اور ادب نواز ہے اس نے شجاعت۔ عالی ہمتی۔ عفت ایثار کے خصائل حمیدہ اُردو ادب کو بخشے۔ مرثیہ ہی نے اُردو شاعری کے محدود میدان کو وسعت دی۔

مولانا حالی مرحوم نے اپنی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں مرثیہ کے فوائد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے[۱]:-

"البتہ ہمارے شعرائنے مرثیہ میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے...... حق یہ ہے کہ اس نئی طرز کی نظم سے اُردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ میر انیس نے اس کو معراج کمال تک پہونچادیا اور اُردو شاعری میں جو مار راکد کی طرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی۔ تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا...... انھوں نے بیان کے نئے نئے اسلوب اُردو شاعری میں کثرت سے پیدا کر دیئے۔ ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا۔ اور زبان کا ایک معتدبہ حصہ جس کو ہمارے شاعروں کے قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال تک محدود تھا۔ اس کو شعرائے سے روشناس کرادیا...... اس خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اُردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے کا مستحق انھیں لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے بلکہ جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کئے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔"

یہ تھی مرثیہ کی حالت۔

لکھنؤ میں غزل گوئی کا رواج ضرور تھا لیکن دلی والوں نے آکر اس میں

---

[۱] مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی صفحہ ۲۳۸ تا ۲۴۲ سنہ ۱۹۳۱ء۔ ناشر رام نرائن لال۔

چار چاند لگا دیئے۔ انشا اور مصحفی نے اُردو غزل کو دربار سے وابستہ کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے زبان اُردو کی جو خدمت کی وہ بھی فراموش نہیں کی جا سکتی ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ[۱]:-

"انھوں (انشاء) نے توسیع زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشا پہلے ہندوستانی شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی صرف و نحو ندوں کی اور جس تحقیق و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت تحریر کی اس سے ان کا پایۂ استادی بلند ہوتا ہے۔"

دوسری جگہ رام بابو ارشاد فرماتے ہیں[۲]۔

"زبان اُردو انشا کی بہت احسان مند ہے جس نے اس کی ترقی اور توسیع کے لئے بہت نئے نئے تجارب اختیار کئے۔"

ان حضرات نے اگر ایک طرف دربار سے شاعری کو وابستہ کر کے اس سے پاکیزگی اور روحانیت کو مفقود کر دیا تو دوسری طرف اس کمی کو تکمیل فن کی کوشش کر کے پورا کیا۔ اظہار قابلیت کی غرض سے لوگ سنگلاخ زمینیں تلاش کرتے اور ان میں بھی مشکل سے مشکل تر بحروں میں طبع آزمائی کرتے۔

لیکن ان کے بعد جن شعراء کا زمانہ آتا ہے۔ در اصل ان کے وقت سے لکھنؤ اسکول کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس سے لکھنؤ کی شاعری اور ادب میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ یہ دور آتش و ناسخ کا زمانہ ہے۔ اس دور میں زبان اُردو کی ترقی اور صفائی سب چیزوں پر مقدم ہو گئی بقول لالہ سری رام صاحب[۳]:-

"اگر شیخ صاحب (ناسخ) موزونی و صحت الفاظ اور تلاش مضامین عالی میں بڑھے ہوئے تھے تو خواجہ صاحب (آتش) بھی لطف محاورہ فصاحت

۱ـ تاریخ ادب اُردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ محمد عسکری صفحہ ۱۸۲ مطبع منشی نول کشور پریس لکھنؤ بار دوم

۲ـ تاریخ ادب اُردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ محمد عسکری صفحہ ۱۷۵ مطبع منشی نول کشور پریس لکھنؤ۔

۳ـ تذکرہ ہزار داستان خمخانۂ جاوید صفحہ ۱۰ مطبع منشی نولکشور پریس لاہور ۱۹۰۸ء۔

نفاست بندش خوش اسلوبی طرزِ بیان میں ان سے کم نہ تھے۔"

ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب فرماتے ہیں[۵۱]:۔

"ناسخ کا رجحان زیادہ تر عروض کی طرف تھا۔ زبان کی صفائی تشبیہات و استعارات کی رنگینی ہر دور سے زیادہ بڑھ گئی .... چونکہ سلطنت کا نقشہ بدل رہا تھا۔ دہلی اُجڑ رہی تھی اور لکھنؤ بظاہر آباد ہو رہا تھا اس وجہ سے اس دور کے کلام میں رجائیت و قنوطیت شاعری کے میدان میں دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ دہلی کے شعراء کے یہاں ایک گونہ یاس و اضمحلال۔ لکھنؤ کے شعراء میں شاعرانہ بے بسی کو چھوڑ کر احساس میں شگفتگی نظر آتی ہے۔"

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی کتاب "شعر الہند" میں ناسخ نے جو تبدیلیاں کی ہیں ان کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں[۵۲]۔

"(۱) پہلے اُردو کو ریختہ کہتے تھے لیکن ناسخ کے وقت سے اس کا نام اُردو رکھا گیا۔

(۲) پہلے غزل کو بھی ریختہ کہتے تھے۔ ناسخ نے غزل کا لفظ رائج کیا اور اس لفظ کو متروک قرار دیا۔

(۳) غزل کی زمینوں میں تصرف کیا اور ردیف کی بنا حروف روابط یعنی کا۔ کے۔ کو۔ سے۔ نے۔ پر۔ تک۔ اور حروف اثبات و نہی یعنی ہے۔ اور نہیں وغیرہ پر رکھی۔

(۴) افعال میں یہ اہتمام کیا کہ جو افعال اصولاً صحیح تھے انھیں پر ردیف و قافیہ کی بنیاد رکھی۔

(۵) قدما کی ایک خصوصیت فحاشی اور بدزبانی تھی اور ہجو سے گذر کر خود غزل میں اس فحش زبان نے بار پا لیا تھا۔ لیکن ناسخ نے اس قسم کے الفاظ سے زبان کو پاک کر کے اسکو مہذب اور شائستہ بنا دیا۔

---

[۵۱] مختصر تاریخ ادب اُردو۔ بار دوم صفحہ ۱۳۸ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد ۱۹۴۰ء۔
[۵۲] شعر الہند حصہ اول صفحہ ۱۹۰ طبع سوم ۱۹۴۲ء۔ مطبع معارف اعظم

(۶) جہاں تک ممکن ہوا فارسی اور عربی زبان کے الفاظ استعمال کئے۔ اور ہندی اور بھاکا کے الفاظ کو چھوڑ دیا۔

(۷) اب فارسی اور ہندی زبان کے جو الفاظ مستعمل تھے ان کی تانیث و تذکیر کا کوئی قاعدہ مقرر نہ تھا لیکن ناسخ نے ان الفاظ کی تذکیر و تانیث کے قاعدے بھی بنائے۔

(۸) بندش کی طرز فارسی کے طرز پر قائم کی جس سے مضامین میں وسعت پیدا ہوگئی اور شعر کے ظاہری حسن میں بھی اضافہ ہوگیا۔

(۹) مضامین میں عاشقانہ طرز کو کم کرکے ہر قسم کے مضامین کو شامل غزل کیا جس سے غزلگوئی کے دائرہ میں نہایت وسعت پیدا ہوگئی ''۔

یہ ہیں وہ خاص تبدیلیاں جو مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے خیال سے ناسخ نے کی ہیں۔ بعض ان میں ایسی بھی تبدیلیاں ہیں جو رائج تو پہلے سے تھیں لیکن بعض اوقات ان کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ مثلاً ریختہ کے بجائے لفظ '' غزل '' ناسخ سے قبل بھی استعمال ہوتا تھا۔ سودا۔ مصحفی۔ اور جرات نے اس لفظ کا استعمال کیا ہے لیکن اصلیت میں ریختہ کو با قاعدہ متروک کرنے کا سہرا ناسخ ہی کے سر ہے۔

لیکن انھیں بزرگوں کے سائے میں چند ایسے نوجوان امتیاز حاصل کرتے ہیں جنھوں نے اس کام کو مکمل کرنے کے ساتھ ہی ادب میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ ناسخ اور آتش کے شاگردوں میں خواجہ وزیر۔ میر وزیر علی صبا۔ نواب سید محمد خاں رند۔ مرزا محمد رضا برق۔ میر علی اوسط رشک۔ تسلیم لکھنوی۔ میر ظفر علی خاں اسیر۔ شیخ امداد علی بحر وغیرہ اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔

۱۸۵۷ء کا معرکہ ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں ایک زبردست سنگ میل تھا۔ ہندوستانی سلطنت اپنی آخری سسکی لے کر ختم ہو چکی تھی۔ انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ مغربی نظام قائم ہو رہا تھا۔ اب وہ خلیج پورے طور پر وسیع اور واضح شکل میں سامنے آچکی تھی جس کی بنیاد سر ٹامس رو نے عہد جہانگیر میں رکھی تھی۔ دربار اور سلطنت کے خاتمہ نے اب اس باب کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا اور اب نئی زندگی کی آمد آمد کا شور تھا۔ ہر طرف تبدیلی تھی زندگی

کا ہر موڑ نئے حالات سے متاثر ہونے لگا تھا۔ مشرقی نظام مغربی نظام سے ٹکرانے کی اُمیدیں ختم کر چکا تھا۔ ان تبدیلیوں نے متوسط درجہ کو ترقی کا موقع دیا جس کے ساتھ ہی ایک نیا ادب فروغ پانے لگا۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں فارسی اور سنسکرت کو رد کر کے اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر عوام میں دو گروہ پیدا کر دیئے تھے۔ اول وہ جو پرانی روایات اور نظام کو سینے سے لگائے محض وثیقوں اور وظیفوں کے سہارے وضعداری سے دن گذار رہا تھا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے پیٹ اور ضروریات سے مجبور ہو کر نئے اثرات قبول کئے۔ انگریزی تعلیم حاصل کی جو اپنے تمدن اور کلچر کا اثر نوجوانوں پر ڈال رہی تھی۔ انگریزی ادب کی ترقی دیکھ دیکھ کر یہ نوجوان ہمارے ادب میں بھی ان ترقیوں کو تلاش کرنے لگے تھے۔

سر سید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد اس نئے طبقے کے علم برداروں میں تھے۔ انھوں نے مغربی ادب کے مقابلے میں ہندوستانی ادب کو پرکھا تو اس میں کمزوری اور پستی پائی، وہ دل و جان سے اس کی ترقی میں لگ گئے۔ ادب کو نئی روشنی سے روشناس کیا۔ اس تحریک کا اثر گو لکھنؤ نے کم قبول کیا، کیونکہ یہاں انگریزی تعلیم کا اثر بہت دنوں کے بعد ہوا۔ شروع میں یہ تحریک لکھنؤ میں غیر مقبول ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ اثرات کام کرتے گئے جہاں تک اُردو نثر کا تعلق ہے شاید لکھنؤ نے سب سے پہلے انگریزی لٹریچر کی روح کو اپنے اندر سمویا۔ بقول پروفیسر سید احتشام حسین[۱]

"غدر کے بعد لکھنؤ پر جو تباہی آئی وہ گو بظاہر ایک حکومت کے خاتمے کی صورت میں نمایاں ہوئی، لیکن اصلاً اس تہذیب پر بھی اس کی گہری چوٹ پڑی جو سکون، فرصت، فارغ البالی اور خوش حالی چاہتی تھی، اس لئے فوراً ہی اس کا تضاد نمایاں ہو گیا۔ اور گو داستانوں نے جو طلسم باندھا اس میں اس عہد فراغت کی تصویریں نگاہوں کے سامنے آتی ہیں جو غدر سے پہلے تھا، لیکن اس کے مٹتے ہوئے اور ملمع اُترے ہوئے نقوش سرشار کے فسانۂ آزاد میں نظر آتے ہیں۔ غدر کے بعد لکھنؤ نے سرشار

---

[۱] مضمون۔ لکھنؤ اُردو کا علمی ادبی مرکز۔ اخبار قومی آواز لکھنؤ صفحہ ۳ ۱۸ مارچ ۱۹۵۶ء

نول کشور پریس۔ اودھ پنچ اور شرر کو پیدا کرکے اپنی مرکزیت برقرار ہی نہیں رکھی، بلکہ اس میں تخلیقی اضافہ کیا۔ اور کئی راہوں پر ملک کی ادبی زندگی کی رہنمائی کی۔ اگرچہ جدید تحریک کا اثر لکھنؤ پر ذرا آہستہ آہستہ ہوا، اور ہوا بھی تو اس کی رنگینی، لطافت، اور نزاکت کا کچھ حصہ برقرار رہا۔ لیکن سرشار۔ شرر اور اودھ پنچ اور بعد میں مرزا رسوا۔ چکبست۔ نادر کاکوروی اور صفی کی موجودگی میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لکھنؤ نے اپنے حصار کے اندر تازہ ہواؤں کو آنے نہیں دیا۔ لکھنؤ کی تہذیب میں ایک بیمار حسینہ کا ذکر تھا۔ توانائی اور بھرپور زندگی سے خالی۔ پھر اس کی ٹکر بھی بیرونی عناصر سے ہوتی رہی۔ اس لئے اس کے نقوش جلد دھندلے ہوگئے دَورِ جدید کی حشر سامانیوں نے اس سے بہت کچھ چھین لیا۔ پھر بھی اس کی علمی اور ادبی مرکزیت قائم رہی۔ اور جہاں تک اُردو زبان اور ادب کا تعلق ہے ایک امتیازی رنگ میں اس کا فیض آج بھی جاری ہے۔ آج بھی یہاں کے علمی ادارے، تہذیبی انجمنیں۔ ادبی مرکز ایک معیار رکھتے ہیں۔"

احتشام صاحب نے کافی وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف فرما دی ہے کہ اگرچہ لکھنؤ میں ان اثرات کا ہم فوراً قبول کرنا نہیں دیکھتے، پھر بھی ان کے اثرات بہت ہی جلد نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو روح آزاد۔ حالی اور سرسید مرحوم ہندوستانیوں میں پھونکنا چاہتے تھے لکھنؤ میں چند برسوں کے بعد پوری طور پر نظر آتی ہے۔ لکھنؤ میں کوئی منظم تحریک تو اس قسم کی نہ چلی اور اسی وجہ سے بعض حضرات کبھی کبھی یہ کہنے لگتے ہیں کہ لکھنؤ ایک بند قلعہ تھا جس میں نئے اثرات قبول نہیں کئے جا سکتے تھے۔ لیکن سرشار کے ناول۔ اودھ پنچ اور نول کشور پریس کی شائع کردہ چیزوں کو دیکھنے والے یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ لکھنؤ میں مختلف خیالات اور رجحانات کی سرگرمیاں برابر ہوتی رہیں۔

سرشار کے ناول جو دراصل ناول نویسی کا سنگ بنیاد کہے جا سکتے ہیں اور ان میں فسانہ آزاد جو ان کا پہلا ناول اور شاہکار بھی ہے یہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوتا ہے۔ اس ناول نے ہم کو وہ روشنی ضرور دکھائی ہے جو سماجی کرداروں کے

روپ میں دیسی کالج کے مجھول۔ ناکارہ۔ فرسودہ اور بے مصرف عناصر کا مضحکہ اڑاتی ہے۔ اور ساتھ ہی نئے، تندرست، جاندار، بے تعصّب، متحرک کرداروں کو ان کے مقابلہ میں کامیاب دکھاتی ہے، جو پرانے علوم کو بے وقت کی راگنی اور مشرقی تعصّب کی نادانی، مغرب سے اور مغربی اثرات سے بچ کر اپنے کو تنگ نظری۔ پرانے امیروں اور نوابوں کی آرام طلبی اور عیش پرستی کو زوال کی آخری منزل قرار دیتی ہے، اور اس کے مقابلہ میں مغربی تہذیب کی بعض باتوں کو قابل قبول قرار دیتی ہے۔ در اصل یہی انداز نظر سب سے اہم ہے جس نے سرشار کے انداز بیان کو زندگی بخشی۔ فسانۂ آزاد میں ہم کو ایسے کردار ملتے ہیں جو خود مغربی تمدّن کا اثر قبول کئے ہوئے ہیں لیکن مشرقی تمدن کے دلدادوں کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ جو خود مغربی فلسفہ سے آشنا ہیں لیکن اس کے مضحکہ اُڑانے والوں کے مخالف نہیں۔ فسانۂ آزاد میں دو متضاد نظریے ملتے ہیں۔ ایک مشرقی تعصّب۔ وہم پرستی۔ قدامت پرستی۔ ہر پرانی چیز کو سینے سے لگائے رکھنا اور ہر نئی چیز کو بربادی اور تباہی کا پیش خیمہ سمجھنا، دوسری طرف مغربی آزادی۔ روشن خیالی۔ علم کی تلاش اور مغربی خیالات کو قبول کرنے کا عام خیال۔ لیکن اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سرشار نے دونوں نظریہ پیش کرتے ہوئے ترقی پسندی کی حمایت ہی نہیں کی بلکہ اس کو جہاں تک ممکن ہو سکا نمایاں کیا ہے۔ یہ اگر نئے خیالات کا قبول کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ سرشار کی زندگی لکھنؤ کی اور خاص لکھنوی تہذیب میں پروان چڑھتی ہے۔ حیدرآباد کا سفر در اصل سفرِ آخرت تھا اس طرح سے بچپن سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک سرشار کی زندگی لکھنؤ کی گلی کوچوں تک محدود تھی۔ اس لیئے ہم کو جوان کے اندر ترقی پسندی ملتی ہے وہ لکھنؤ کی ترقی پسندی ہے، نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں پر مولانا عبدالحلیم شرر کا وہ قطعہ تاریخ پیش کردیا جائے کہ جو مولانا نے فسانۂ آزاد کے سلسلہ میں تحریر فرمایا تھا[۱]

---

[۱] اودھ پنچ۔ مضامین چکبست۔ صفحہ ۲۲۶ تا ۲۴۳ طبع دوم ۱۹۳۶ء۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ — کن کن محاوروں سے کیا ہے نباہ واہ
دیکھیں جو شوخیاں ترے خامہ کی غور سے — بولے شفیق واہ۔ عدو بولے آہ، آہ

کرتا شرر ہے مصرع تاریخ پیش کش
کیا بول چال لکھی رتن ناتھ واہ واہ

مولانا کے قطعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنؤ میں دو قسم کے خیالات رکھنے والے لوگ تھے۔ ایک وہ جو اس کو پسند کرتے تھے یعنی مغربی تہذیب کے دلدادہ، اور ترقی پسند خیالات کے لوگ، دوسرے وہ جو ہر پرانی اور مشرقی چیز کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور اس ترقی پسندی پر افسوس کرتے تھے۔

اودھ پنچ لکھنؤ کی عام زندگی کی مکمل تصویریں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور ان دونوں خیالات کے انسانوں کا مکمل نقشہ پیش کر کے ترقی کی راہ پر لوگوں کو لگاتا ہے۔ یہ اخبار لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں نکلنا شروع ہوا۔ چکبست مرحوم نے "گلدستہ پنچ،، کا مقدمہ تحریر فرماتے ہوئے اودھ پنچ کی مکمل زندگی کا تجزیہ اس کی خدمات اور انجام کا حال پیش کیا ہے۔ مقاصد یوں بیان کرتے ہیں:-

"اودھ پنچ اور ہندوستانی پہلے دو اخبار ہیں جنھوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی، اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولیٹکل اور سوشل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا مستقل سوشل اور پولیٹکل مسلک تھا۔ اس صوبے میں ہندوستانی کانگریس کا چراغ سمجھا جاتا تھا مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہاں اودھ پنچ کی بجلی چوند پیدا کرتی تھی۔"

ہر چند کہ اودھ پنچ مغربی تمدن کا دلدادہ نہ تھا پھر بھی اس پر مغربی اثرات صحافت اور ظرافت دونوں حیثیتوں سے طاری تھے۔ اس سے قبل ظرافت اور طنز دونوں کا فقدان تھا۔ لیکن اودھ پنچ نے ان دونوں چیزوں کو نہ صرف پیش کیا بلکہ اعلیٰ معیار پر پیش کر کے اردو ادب کی اس بڑی کمی کو دور کیا۔ اودھ پنچ

اس زمانہ کی پیداوار ہے جب سلطنت اودھ ختم ہو چکی اس کے ساتھ ہی شہنشاہی نظام ختم ہوا۔ لیکن دلی کی طرح بربادی نہ آئی۔ نواب ابھی باقی تھے، یہاں اگرچہ حکومت ختم ہو چکی تھی لیکن ابھی پیسہ کی اتنی کمی نہ ہوتی تھی۔ پرانا تمدن اب ڈگمگا رہا تھا اور ساتھ ہی وہ قدریں جو افضل تصور کی جارہی تھیں اب بے کیف ہو رہی تھیں۔ اب یہاں سوداگروں کی حکومت تھی جو عوام پر حکومت کرتے۔ عوام سے ملنا یا ان کی کچھ سننا ان کا کام نہ تھا۔ وہ اپنے تمدن اور زبان کو عوام پر لادتے جارہے تھے۔ اب پرانی تہذیب اور تمدن کا چراغ گل ہونے کو تھا، پھر بھی عوام کی ایک اچھی خاصی تعداد ان روایات کو سینے سے لگائے تھی — اودھ پنچ کے لکھنے والے سب بلند مذاق اور تعلیم یافتہ تھے۔ وہ آخران چیزوں سے کیونکر اثر نہ لیتے۔ چنانچہ انھوں نے اثر لیا اور اس زمانہ کا مکمل خاکہ اُڑا دیا۔

اودھ پنچ نے کسی سے بغاوت نہیں کی۔ بلکہ طنز کے پردے میں اصلاحی کام انجام دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض معاملات میں اودھ پنچ قدامت پرست تھا۔ مثلاً سرسید اور ان کی تجاویز، اس کو پسند نہ تھیں پھر بھی وہ ہندوستانی روسا کا ناصح اور اصولِ کانگریس کا حامی تھا۔ اصلیت میں یہ اخبار اودھ کے اندر جو خیالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور عوام جو ان سے متاثر ہوئے ان کا آئینہ تھا۔

منشی نول کشور پریس اُردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ گو کہ اس سے قبل لکھنؤ میں اور بھی پریس موجود تھے جن کا مفصل ذکر ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ادبی تنقید میں کیا ہے لیکن انھوں نے ادب کی خدمت اس طرح سے نہیں کی جس طرح سے نول کشور پریس نے انجام دی۔ اس پریس نے ایک طرف تو اُردو ادب کو اس کی ماضی کی یادوں کو زندہ کرنے کا موقع دیا۔ دوسری طرف نئے رجحانات کو ترقی کا موقع دیا۔ ایک طرف تو سیکڑوں ترجمے فارسی اور سنسکرت سے زبان اُردو میں کیے گئے۔ دوسری طرف پرانی کتابوں کی طباعت واشاعت ہوئی جس نے ان نایاب اور کمیاب نسخوں کو جو اگر اس وقت نہ چھاپے گئے ہوتے تو آج اُردو ادب میں شائد کوئی ان کا نام بھی نہ ہوتا، دوبارہ زندگی

بخشی۔ ترجموں اور داستانوں کے ساتھ ہی ساتھ اودھ اخبار کو جاری کرکے فن صحافت کو عروج دیا گیا۔ اس نے نئے نئے لوگوں کو میدان میں لاکر نئے اخبارات نکلوائے۔ اس اخبار نے صحافت کی خرابیوں سے اپنے دامن کو پاک وصاف رکھا یہی وہ اخبار ہے جس نے سرشار اور شرر کو اُردو ادب میں روشناس کرایا۔ اس پریس نے مختلف کتابوں اور اخبارات کی اشاعت کرکے لکھنؤ میں مختلف خیالات اور رجحانات کی سرگرمیوں کو ترقی کرنے کا موقع دیا۔

ایک طرف نثر اُردو اپنے اس ترقی کے دَور سے گذر رہی تھی، دوسری طرف اُردو شاعری میں بھی اس کی جھلک صاف نمایاں ہونے لگی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے جدید ادب کی جس تحریک کی ۱۸۷۴ء میں بنیاد رکھی اس کے اثرات تمام ملک میں پھیلے۔ اب ملک کے حالات بدل چکے تھے۔ شاہی دَور ختم ہوچکا تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی میں ہر وقت نئی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ انگریزی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہوچکی تھیں لوگوں نے ان اثرات اور خیالات سے متاثر ہونا شروع کردیا تھا۔ اور ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا تھا جو ان کو ہر حالت اور ہر قیمت پر قبول کرنے لگا تھا۔ یہ اندھی تقلید تھی۔ ایک دوسرا طبقہ ان حضرات کا تھا جس نے سوچ سمجھ کر چیزوں کو سینے سے لگائے رہنے کے ساتھ کچھ اچھے اصول اپنانے پر تیار تھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی حضرات موجود تھے جو قطعی کسی تبدیلی کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر تبدیلی ہوئی اور نئے خیالات قبول کئے گئے تو ان کی ہر وہ چیز برباد ہوجائے گی جس کو وہ اب تک عزیز رکھتے ہیں۔ لکھنؤ میں بھی مختلف دھارے اسی طرح سے بہہ رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کے زیادہ تر لوگ شروع میں قدیم روایات کو قائم رکھنے والے گروہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن پھر بھی لکھنؤ میں اچھی خاصی تعداد ان حضرات کی تھی جو تبدیلیوں پر سنجیدگی سے غور کرتے اور ان کو قبول یا مسترد کرتے۔ اس انداز فکر کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ پچھلے دنوں ہماری زبان اور ہماری ادبی تخلیقات میں بلا تکلف عربی اور فارسی الفاظ کی جو بھرمار ہونے لگی تھی اب اس میں کمی ہونے لگی۔ ناسخ اور ان کے بعض شاگردوں نے

اردو شاعری میں عربی اور فارسی الفاظ کی جو کثرت رائج کر رکھی تھی ان شعراء نے اس سے نجات حاصل کرنا شروع کر دی۔ دربار اودھ کے برباد ہونے اور دربار رام پور کے آباد ہونے سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کے شعراء جب ایک ہی دربار سے وابستہ ہو گئے تو آپس کی اختلافی تلخی ختم ہوئی اور لکھنؤ کے شعراء نے دہلی کے شاعروں کے خیالات اور فن پر غور کرنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے امتزاج سے ایک خوشگوار رنگ پیدا ہو گیا۔ خارجیت کا پہلو کم ہوا حقیقت اور معرفت کا اثر غالب آنے لگا۔ اب تصوف پھر لکھنوی شعراء کی شاعری کا ایک جزو بنتا جا رہا تھا جس کی مثال امیر اور ان کے شاگردوں کا کلام ہے۔ اس دور کے شعراء نے دہلی کے خیالات پر سنجیدگی سے غور کر کے ان کو قبول کرنا شروع کیا اور انکے شاگردوں نے بلکہ بعض ان کے زمانہ کے شعراء نے غالب۔ مومن۔ اور میر کے کلام کے اثرات پوری طور پر قبول کر کے ان کی پیروی کی۔

ناسخ کے بعض شاگرد مثلاً بحر۔ مہر کے کلام سے یہ اثرات پوری طور پر نمایاں ہیں۔ بحر کے کلام میں اگر ایک طرف ناسخ کے اثرات پیچیدہ تمثیلوں اور استعاروں کی شکل میں پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف کلام کی صفائی اور سلاست ان کو لکھنوی شعراء میں ممتاز بھی کرتی ہے۔ ان کے بعض سادہ اور سلیس اشعار پڑھنے سے دلی والوں کی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ مثلاً

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں
دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں
ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

ان کے استاد بھائی امیر کا کلام سلاست۔ تناسب اور زبان پر قدرت کے ساتھ ساتھ صاف اور سلیس ہونے کی وجہ سے مشہور ہے ساتھ ہی امیر کا کلام صحیح جذبات نگاری پر مبنی ہے۔

چکبست کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے، جس میں خود لکھنؤ بہت کچھ بدل چکا تھا، اگرچہ اس کی بعض

روایتیں اور خصوصیات اب بھی قائم تھیں۔ چنانچہ صحت زبان۔ انداز بیان اور استاد
کے معاملہ میں لکھنؤ اب بھی ان روایات کا ترجمان تھا جو گزشتہ صدی سے چلی آرہی تھیں
اس بات کی طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ لکھنؤ کے ادبی معرکے اپنی ایک خاص
حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام دنیا کے ادب میں ایسے ادبی معرکوں کا
پتہ چلتا ہے جو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں اور جن میں شاعرانہ چشمکوں سے ادبی
گروہ بندی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے۔ دکن میں سراج اور
داؤد دلی میں سودا اور ضاحک۔ انشا اور عظیم۔ ذوق اور غالب کے معرکے تاریخ ادب
کا جزو بن گئے ہیں۔ لکھنؤ میں انشا اور مصحفی۔ آتش اور ناسخ اور اس کے بعد اور بعض
دوسرے اساتذہ کی باہمی چشمکیں ہمیشہ زیر بحث رہی ہیں۔

لکھنؤ میں اس کی ابتدا کچھ اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ نواب آصف الدولہ
بہادر تیرھویں صدی کے شروع میں فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ لکھنؤ میں ان کے
دربار کی کشش نے مختلف شعراء کو جمع کرلیا تھا۔ مصحفی؛ انشا کے زبردست معرکے انھیں
کے زمانے میں پیش آئے جس کا مفصّل ذکر مولانا آزاد نے آبِ حیات میں کیا ہے اور
اُردو ادب کی ہر کتاب مولانا سے خوشہ چینی کرکے ان واقعات کو تحریر کرتی رہی ہے
مختصر یہ کہ مصحفی کے بعض اشعار پر انشا اور ان کے ساتھیوں نے مذاق اُڑایا اور نوبت
یہاں تک پہونچی کہ سارا کا سارا شہر ان کے معرکوں میں شریک ہوگیا۔ ایک
دوسرے پر زبردست اعتراضات کرنے لگے ہر ایک کو ایسے مواقع کی تلاش رہنے
لگی کہ کسی سے کوئی لغزش ہو تو فوراً اس کی گرفت کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ان
معرکوں میں بعض اوقات ادب سے لوگ شائستگی کو چھوڑ کر ابتذال کے حدود میں
داخل ہوگئے۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ ان معرکوں سے زبان کو بہت فائدہ ہوا۔

ان ادبی ہنگاموں کے بعد آتش اور ناسخ کے معرکے پیش آتے ہیں۔ ان
حضرات نے جو بھی بات کہی سنجیدگی، متانت اور ادبی و اصلاحی رنگ میں پیش کی
دوسرے کی گرفت کی فکر ضرور رہی، لیکن باوقار طریقہ سے۔ یہ ایک دوسرے کی پوری
عزّت بھی کرتے تھے اور اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بھی بناتے تھے۔ ایک دوسرے کے
احترام کا یہ عالم تھا کہ ناسخ کی موت کے بعد آتش مرحوم نے شعر کہنا چھوڑ دیا کہ لطف

اسی وقت تھا جب ناسخ زندہ تھے۔ اب کوئی شعر سمجھنے والا نہیں رہا۔ ان حضرات نے اپنی استادی ثابت کرنے کے لئے دو غزلہ سہ غزلہ لکھ لکھ کر اپنی ندرت بیان کا مظاہرہ کیا اور طرح طرح کے قافیوں کا اضافہ کیا۔ زبان کی صفائی اور صحت کے ساتھ یہ ترقی اُردو ادب میں بڑی اہم چیز ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے معرکے بھی کم اہمیت نہیں رکھتے۔ معاصرانہ چشمک سے بات یہاں تک پہونچی کہ ان کے قدرشناسوں کے حرف گیری اور شائستگی کے دو گروہ انیسیے اور دبیریے قائم ہوگئے۔ یہ معرکے بھی ادبی حدود کے اندر ہی رہتے۔ اور ان سے زبان و ادب کو زبردست فائدے ہوئے۔ ان دن رات کے معرکوں نے عوام کی معلومات میں زبردست اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شعری صلاحیت اور تنقیدی شعور کو بیدار کر دیا۔

انتزاع سلطنت اور واقعات غدر نے لکھنؤ کی حکومت کو برباد کر دیا۔ اور لکھنؤ کے شعر و ادب کا دربار رام پور میں منتقل ہو گیا۔ وہاں امیر اور داغ کے معرکے یادگار رہیں گے۔ اس کے علاوہ جلال کے معرکے بھی کافی اہم ہیں۔ لیکن ان تمام تباہیوں کے باوجود لکھنؤ میں شعر و ادب کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر اودھ پنچ نے چار معرکے لڑے جن میں دو معرکے ایسے ہیں جن میں چکبست کا بھی کافی دخل رہا ہے ایک معرکہ تو خود ان کے اور شرر کے درمیان ہی چلا۔ یہ معرکہ "گلزار نسیم" کے نئے اڈیشن کے شائع ہونے کے بعد ۱۹۰۵ء میں ظہور پذیر ہوا۔ چکبست نے اس مثنوی پر ایک مقدمہ لکھ کر شامل اشاعت کر دیا تھا۔ اس اڈیشن پر مولانا شرر نے ریویو کیا اور رسالہ دلگداز میں گلزار نسیم پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ اس کا جواب چکبست نے دیا اور پھر تو وہ زبردست معرکہ پیش آیا کہ مصحفی اور انشا کا زمانہ یاد آگیا۔ چکبست سنجیدہ انسان (جس کی سنجیدگی کسی نامناسب حرکت کو پسند نہ کر سکتی) اس طرح سے جھگڑوں میں پڑنا انتہائی تعجب کی چیز ہے۔ لیکن اس وقت لکھنؤ کی فضا کچھ اسطرح کی تھی کہ ایک سنجیدہ انسان بھی جسے ادب سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا اس سے الگ نہ رہ سکتا تھا۔

لکھنؤ میں اس زمانہ میں اگر ایک طرف قدامت پسندی قائم تھی تو دوسری

طرف دورِ جدید کی عام خصوصیات نمایاں ہونے لگی تھیں۔ جیسے ہی آتش اور ناسخ
کے شاگردوں کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ ویسے ہی یہاں کے شعراء اپنے نئے نئے راستے کی
تلاش شروع کر دیتے ہیں اور اس تلاش میں وہ دہلی کے اساتذہ خاص کر غالب
اور مومن کے پیرو بن جاتے ہیں۔ اس دور کے دوسرے شعراء کے ساتھ چکبست
بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے اور انھوں نے غالب کی پیروی شروع کر دی۔ لیکن
ساتھ ہی وہ آتش اور انیس کے اثرات کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم اور دورِ جدید
کے تقاضوں سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اردو شاعری کی عام روایات سے کسی
حد تک کنارہ کش ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کی مکمل تصویر آگے کے باب میں
زیرِ بحث آئے گی۔

اصلاحی نظریات

۱۸۵۶ء کے ہنگامے نے ایک طرف ہندوستانی سلطنتوں کا خاتمہ کر کے انگریزوں کو برسرِ اقتدار کر دیا۔ دوسری طرف ہندوستانی دل و دماغ پر اس شکست سے مُردنی چھا گئی۔ کشمیری پنڈتوں پر بھی اس کا شدید اثر ہوا اور وہ لوگ اپنے تمام علمی و ادبی ماحول کو بھول کر کج روی اور اخلاقی پستی کا شکار ہو گئے۔ اسی زمانہ میں چند ایسی بزرگ ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اصلاح کی طرف قدم اٹھایا۔ جس طرح سر سید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی، اسی طرح کشمیری پنڈتوں میں بھی بعض حضرات نے زبردست اصلاحی کوشش کی۔ جس کا مکمل ذکر پنڈت شمبھو ناتھ نے اپنے مضمون "اصلاحِ قوم" میں کیا ہے۔ اس کے ضروری حصّے پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ آئندہ مسائل کی وضاحت میں آسانی ہو۔

> "سوشل رفارم کی بنیاد شیو نرائن بہار نے ۱۸۶۵ء کے قریب ڈالی اسی غرض سے اس بہی خواہ قوم نے ۱۸۶۷ء سے قبل ہی کشمیر کا سفر کیا اور واپس آکر فوراً ہی مراسلہ کشمیر جاری کیا اور ایک انجمن قومی دور رفتگان کشمیر کے نام سے قائم کی۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کشمیری اپنی گری ہوئی حالت کو سنبھال کر پسماندگان کشمیریوں کی دستگیری کریں۔ مراسلہ کشمیر سے یہ امید تھی کہ وہ دو چار سال میں قوم کو اصلاح کے واسطے تیار کر دے گا اور صغیر سن لڑکوں کے واسطے انجمن اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ مناسب تعلیم پا کر کم از کم دس بارہ شخص تو ایسے تیار ہو جائیں جنھیں عملی کارروائی کرنے کی جرأت ہو۔ اس انجمن کی کیفیت ایک ہفتہ وار کلب کی تھی ۱۸۷۷ء میں یہ انجمن ٹوٹ گئی اور مراسلہ کشمیر کا دور بھی ایک دو برس کے بعد ختم ہو گیا — انجمن کا دور رفتگان کشمیر

کے ٹوٹنے کے تھوڑے ہی دن بعد مراسلہ کشمیر میں شام کشن صاحب کول نے ایک سوشل انجمن قائم کرنے کی تحریک پیش کی۔ جلد ہی کلب قائم ہوگیا اور کلب کا نام "کشمیری نیشنل کلب" رکھا گیا۔ پنڈت بشن نرائن در اآپھر اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ کچھ روز بعد پریسیڈنٹ صاحب کی تحریک پر ممبروں نے حقہ نوشی۔ شراب نوشی۔ قمار بازی وغیرہ سے پرہیز کرنے کی قسم کھائی ــــ ۱۸۸۴ء میں کلب کے سکریٹری پنڈت بشن نرائن ولایت گئے اور قوم میں تلاطم برپا ہوگیا۔ پریسیڈنٹ صاحب کی زبان سے کہیں نکل گیا کہ کلب کا مقصد آج پورا ہوا۔ اس فقرے نے اشتہار کا کام کیا۔ اب جھگڑا بہت بڑھ گیا آخر کلب توڑ دیا گیا لیکن اس سے بھی مصالحت نہو سکی۔ ۱۸۸۶ء میں بشن نرائن در ولایت سے واپس ہوئے اور پرائشچیت (کفارہ ادا کرنا) کیا جس میں ان کے خاندان والوں کے علاوہ صرف پانچ آدمیوں نے شرکت کی۔ غرض پھر نئے پرانے خیالات کی زبردست ٹکر ہوئی اور فوراً ایک سبھا دھرم سبھا کے نام سے بن گئی جس نے دعویٰ پیش کیا کہ جو ولایت جائے یا دانستہ ولایت جانے والوں کے ساتھ کھائے ان کی پرائشچیت جائز نہیں۔ دوسری طرف ایک اور سبھا بشن سبھا قائم ہوگئی جس کا جواب ہوا کہ اگر سفر ولایت تعلیم کی غرض سے ہوا تو اس کی پرائشچیت جائز ہے۔ ۱۸۸۹ء کے بعد جوش میں اتنی کمی ہوگئی کہ پھر لوگوں کا خیال اصلاح کی طرف گیا۔ لہٰذا اعلان کیا گیا کہ لڑکیوں کی تعلیم کی بابت یکجا ہو کر کچھ مشورہ کیا جائے۔ دوسرے سال اس کا نام سوشل کلب ہو گیا۔ لوگ پہلے ہی سال سے اس میں جوق درجوق شریک ہونے لگے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے واسطے کنیا پاٹھ شالہ قائم ہوا۔ غرض کہ فریقین میں پھر پرانے مراسم قائم ہو چکے تھے کہ عین کریال میں غلہ لگا کہ ۱۹۰۱ء میں غیر ضروری مسئلہ ترک پرائشچیت قبل از وقت قوم کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس سے کنیا پاٹھ شالہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ کانفرنس معطل ہوگئی۔"

ا؎ رسالہ بہار کشمیر مئی ۱۹۴۲ء صفحہ ۷ تا ۱۰

یہ طویل اقتباس تاریخی طور سے بہت واضح انداز میں کشمیریوں کی اصلاحی تحریک کا نقشہ پیش کرتا ہے جس پر اضافہ کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۰۰ء سے لیکر ۱۹۰۴ء تک کسی طرح کی کوئی اصلاحی تحریک کشمیریوں میں نہیں ملتی۔ لیکن اس کے بعد سے چکبست کی تحریک اور عملی اقدام آتے ہیں۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب قومی حیثیت سے کشمیریوں کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانہ سے متعلق چکبست کی نظمیں بہت اہم ہیں۔ چکبست اپنے قوم کی بربادی اور ان کی تباہی سے جس طرح متاثر تھے اس کا مکمل اظہار مرقع عبرت (۱۸۹۸ء)۔ آب انگور (۱۸۹۹ء) میں نمایاں ہے۔ مرقع عبرت میں انھوں نے نوجوانوں کی حالت پیش کرتے ہوئے تحریر کیا ہے

عبرت نہیں دیتا انھیں نیرنگ زمانہ — عمران کی فقط لہو ولعب کا ہے فسانہ
تعلیم کہاں اور کہاں صحبت دانا — بس پیش نظر رہتا ہے آئینہ وشانہ

گر رخ پہ گرے موئے پریشاں پہ نظر ہے
اک شغل یہی ان کے لئے شام وسحر ہے

مٹی میں یہ قدرت کے عطیے ہیں ملاتے — کچھ نشو ونما جوہر ذاتی نہیں پاتے
عزت جو بزرگوں کی ہے وہ بھی ہیں گنواتے — بازاروں میں دولت ہیں جوانی کے لٹاتے

کاشانۂ تہذیب سنورتا نہیں دم بھر
وہ نشہ چڑھا ہے کہ اترتا نہیں دم بھر

پاس ادب وحسن لیاقت نہیں رکھتے — پاکیزہ وپُرجوش طبیعت نہیں رکھتے
آنکھوں کے لئے سرمۂ عبرت نہیں رکھتے — دل رکھتے ہیں پر درد محبت نہیں رکھتے

کیا غم چمن قوم ہے ویراں کہ ہرا ہے
نخوت کی ہوا سے سر شوریدہ بھرا ہے

ہمت نہیں لیکن دل پُرجوش پہ نازاں — بے ہوش وخرد ہیں خرد وہوش پہ نازاں
بدشکل ہوں پر چشم ولب وگوش پہ نازاں — کم ظرف کوئی اپنے تن وتوش پہ نازاں

نیرنگیٔ افلاک کا ڈر ان کو نہیں ہے
فرعون ہیں موسیٰ کی خبر ان کو نہیں ہے

مفلس ہیں مگر خبط امیروں سے سوا ہے اچھے یہ اسیر قفس حرص و ہوا ہیں
ناموس کے طالب ہیں نہ پابند حیا ہیں سیرت سے غرض کچھ نہیں صورت پہ فدا ہیں
پروا نہیں مانگے کا اگر جامۂ تن ہو
سودا ہے تو یہ ہے کہ نہ دامن پہ شکن ہو

خودشان ریاست میں ہوئے جاتے ہیں برباد گو حجرۂ کلفت میں کڑھے مادر ناشاد
دیکھے نہ سنے خلق میں اسطرح کے آزاد کیا باعث عبرت ہو انھیں قوم کی فریاد
جو شرم سے میلے نہ ہوں تیور ہیں یہ ان کے
دل رکھتے ہیں فولاد کا جوہر ہیں یہ ان کے

بس نفس پرستی کو سمجھتے ہیں یہ راحت حصّے میں نہیں ان کے جوانی کی لطافت
وہ جوہر عالی ہیں نہ وہ حسن لیاقت جن سے کہ ہے پاتی پر پرواز طبیعت
آتا ہے نظر اور سماں ارض و سما میں
اُڑتا ہے بشر عالم بالا کی ہوا میں

یہ بھی ان نوجوانوں کی افسردہ حالت جس نے چکبست کو مجبور کیا تھا کہ وہ ان کی اصلاح کی طرف قدم اُٹھائیں۔ یہ نظم ۱۸۹۸ء میں لکھی گئی۔ نوجوان جن کی زندگی کا حاصل محض "آرام لپنڈی" رہ گیا تھا جن کو تعلیم سے کوئی لگاؤ نہ تھا محض ظاہری شان اور نمائش جن کی زندگی کا جزو اعظم ہو گیا تھا۔ جن کو "بزرگوں کی عزت گنوانے" میں ذرا بھی تکلّف نہ تھا۔ جن کو قوم کی بربادی کا خیال بھی نہ ہوتا تھا۔ ان کی اصلاح چکبست کا کام تھا۔ ۱۸۹۹ء کی نظم "آب انگور" میں انھوں نے جو کشمیریوں کی حالت پیش کی ہے وہ بھی قابل غور ہے — فرماتے ہیں ؎

محیط دہر میں تہذیب کا جو دَور ہوا ہوا بدل گئی رنگ زمانہ اور ہوا
دماغ کے لئے سامان فکر و غور ہوا خدا کی شان جہاں میں عجیب طور ہوا
گھٹا جو جہل تو سامان عز و جاہ بڑھے
شعور کو جو ترقی ہوئی گناہ بڑھے

جو غور و فکر ہوئے زینت جنوں آباد سجائے عقل نے آسائشوں کے باغ مراد
بڑی ترقی علمی سے عیش کی بنیاد برائے نشہ ہوئی حکمت کشید ایجاد

جہاں میں آب طرب کا ظہور اس سے ہوا
خیال پاسِ ادب دل سے دُور اس سے ہوا

ہوئی جو بادہ کشی باغِ دہر میں منظور
دل بشر سے ہوئی یک قلم مروّت دُور
برنگِ شیشہ جو نازک تھا دانۂ انگور
کیا اک آن میں سنگِ جفا سے توڑ کے چُور

دلِ عروس گلستاں کو دردناک کیا
بھری بہار میں ظالم نے خونِ تاک کیا

اس کے بعد وہ شراب کے متعلق ان لوگوں کے خیالات پیش کرتے ہیں جن کے نزدیک شراب سب کچھ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ شراب کی خرابیوں کو بیان کرتے جاتے ہیں۔ دراصل یہ بھی ایک اصلاحی قدم تھا کہ شراب سے لوگ پرہیز کریں اور اس بری عادت سے جو بربادی ہورہی ہے دُور ہو۔ چند بند پیش ہیں ؎

نہ تھا یہ ہوش کہ اس پھول میں ہے رنگ خزاں
تباہ ہوتی ہے اس سے بہارِ عمرِ رواں
وہ بُو ہے اس کی دماغ بشر ہو جس سے گراں
ہے اسکے رنگ سے خونِ جگر کا رنگ عیاں

ہے خوشگوار یہ سوہانِ روح و جسم ہے یہ
ہوئے اسیر ہزاروں عجب طلسم ہے یہ

رفیق اسکی ہے مستی، عدو شعور اس کا
وداعِ ہوش کا سامان ہے ظہور اس کا
خمار مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا
سیاہ قلب کو کردے جو ہے وہ نور اس کا

لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

عدو بشر کی یہ ہے اس پہ ہے خدا کا عتاب
کسی کے دل میں کرے گھر نہ بس یہ خانہ خراب
نہ اسکے شوق میں برباد ہو کسی کا شباب
کسی کے دل میں الہٰی نہ ہو ہوائے شراب

تباہ سیکڑوں روشن دماغ اس نے کئے
بجھا کے داغ ہزاروں چراغ اس نے کئے

شراب کی مذمت چکبست نے جن الفاظ میں کی ان سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ اس کے خراب اثرات سے پوری طرح واقف تھے اور ان کی دلی تمنّا اور آرزو تھی کہ قوم اس بربادحالی سے نکلے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے انھوں

نے ایک کلب قائم کیا تھا۔

چکبست نے ۱۹۰۳ء میں ایک کلب کشمیری ینگ مِن ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کیا۔ اس کا ذکر وہ خود بھی اپنی نظم "دردِ دل" میں کرتے ہیں۔ کلب کے آٹھویں سالانہ جلسہ میں جو ۱۹۱۲ء میں ہوا یہ نظم پڑھی گئی تھی ؎

چہرۂ گل پہ یہاں پاس ادب کی ہے نقاب
قوم میں آٹھ برس سے ہے یہ گلشن شاداب

اسکے کانٹوں پہ کیا میں نے نثار اپنا شباب
میرے آئینۂ دل میں ہے فقط اس کا جواب

کام شبنم کا لیا دیدۂ تر سے اپنے
میں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے

اس کلب کے ساتھ ہی انھوں نے ایک لائبریری قائم کی جس کا نام شیو بہار مرحوم کے نام پر بہار لائبریری رکھا۔ کلب کے مقصد کی وضاحت کے لئے کلب کی چند برسوں کی رپورٹیں پیش کی جاتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہوجائے گی۔ کلب کے چھٹے جلسہ میں جو ۱۹۱۰ء میں ہوا کلب کے سکریٹری پنڈت ترلوکی ناتھ کول صاحب فرماتے ہیں[۱]۔

"کلب کا اصل مقصد نوجوانوں کی اصلاح ہے۔ ان کے دماغ کو علم کے فوائد سے آگاہ کرنا ان کو بلند درجہ کی تعلیم کے واسطے تیار کرنا۔ ان کو تمام سوشل خرابیوں سے الگ رہنے اور آپس میں میل جول اور بھائی چارہ کرنے کی ٹریننگ دینا ہے۔"

کلب کے ساتویں جلسہ کی سالانہ رپورٹ میں ترلوکی ناتھ صاحب پھر فرماتے ہیں[۲]:۔

"اس کلب کا مقصد ایک مرکز کی حیثیت سے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی خدمات انجام دینا ہے اور انھیں مضر اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔ ان کے چال چلن کو درست کرنا اور انکے اندر اخلاق اور ہمدردی کو استحکام دینا ہے۔ اسکے ساتھ ہی ان میں ادبی

۱؎ چھٹے جلسہ کی سالانہ رپورٹ جو ان رجسٹروں میں موجود ہے جسے گرٹو صاحب نے عنایت فرمایا ہے۔

۲؎ ساتویں جلسہ کی سالانہ رپورٹ جو ان رجسٹروں میں موجود ہے جسے گرٹو صاحب نے عنایت فرمایا ہے۔

صلاحیت کو بھی پیدا کرنا ہے۔ مختصر طور پر اس کی کوشش کی گئی ہے کہ نوجوانوں کو اپنی زندگی کامیاب بنانے کے لئے تیار کر دیا جائے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ انھیں واقعی تعلیم یافتہ اور مہذب بنا دیا جائے بجائے اس کے کہ وہ صرف نام کے گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ ہوں۔

ہم نے اپنے نوجوانوں کی جسمانی تربیت پر بھی توجہ کی ہے۔"

کلب کی دسویں سالانہ رپورٹ میں جو ۱۹۱۴ء میں پیش ہوئی، تر لوکی ناتھ صاحب نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کلب کے مقاصد کو بیان فرمایا ہے[۱]:۔

"ہماری جماعت کا ابتدائی مقصد اپنے ممبروں کی دماغی اخلاقی اور عقلی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا ہے نہ کہ صرف انھیں اچھے مقرر اور عمدہ مضمون اور یونیورسٹی کے انعامات حاصل کرنیوالا بنانا ہے۔ ہم نے یہ مقصد پیشِ نظر رکھا ہے اور ہماری بے لوث کوشش کارگر ثابت ہوئی۔"

۱۹۱۵ء کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے برج کشن گرٹو صاحب کلب کے مقاصد مندرجہ ذیل طریقہ پر بیان کرتے ہیں[۲]۔

"کوئی بھی پُر جوش سماجی اصلاح کا مظاہرہ کرنا ہمارے دائرہ عمل سے باہر ہے۔ ہماری جماعت کا خاص مقصد نوجوانوں کی اصلاح ہے۔ انکو سچے اصلاحی جذبہ کے الجھانے والے خطرے سے بچا سکیں جس کی بنیاد ایثار اور محبت کے جذبہ ہی ہے ...... بچوں اور جوانوں کی تعلیم کی عظیم اہمیت سبھی عقلمند اور ذمہ دار ہستیاں تسلیم کرتی ہیں۔ لیکن وہ اسباب جنھوں نے ہمیں ان خیالات سے الگ کیا ہے ان کے جائزہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں نوجوانوں کی اصلاحی تعلیم کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اور درحقیقت ان کے ماحول میں بھی اس کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اپنے چاروں طرف ہونے والی تمام باتوں کی بخوبی واقفیت اور بہت سی ذمہ دار و مجبر کوارٹرس سے کی گئی تحقیقاتیں ہمیں

---

۱ دسویں جلسہ کی سالانہ رپورٹ جو ان رجسٹروں میں موجود ہے جسے گرٹو صاحب نے عنایت فرمایا ہے۔

۲ کلب کی گیارھویں رپورٹ جو ان رجسٹروں میں محفوظ ہے جو گرٹو صاحب نے عنایت فرمائے ہیں۔

یہ کہنے کے لائق کر دیتی ہیں کہ اسکولوں اور کالجوں کے درجات میں پھیلی ہوئی فضا زندگی کی ناقابل بیانات، عادات اور ناپاک خیالات سے پُر ہے۔ اور اس سے لڑکے بجائے اخلاقی تعلیم حاصل کرنے کے اکثر ایسے سبق سیکھ لیتے ہیں جو کہ ان کی جسمانی اور اخلاقی تنزلی کا باعث ہوتے ہیں۔"

چکبستؔ کی مشہور نظم "جلسہ کانفرنس" جو ۱۹۰۳ء میں لکھی گئی وہ غالباً کلب کے شروع کے جلسہ میں پڑھی گئی۔ اس نظم میں وہ لوگوں کے خیالات اور کلب کے مقاصد کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اثرات کا یہ نظم ایک پرتو ہے۔ تحریر فرماتے ہیں ؎

ہر اک کو آج جوشِ محبّت دوچند ہے — آوازۂ حمیّت وغیرت بلند ہے
غل ہے کہ راہ نحس تنزل کی بند ہے — مردوں کو شاہراہ ترقی پسند ہے

اُمیدہائے نوکا دلوں میں ہجوم ہے
ہاں انعقاد جلسۂ قومی کی دھوم ہے

ہاں کیوں نہ ہو کہ مایۂ فخرِ وطن ہے یہ — گل جس میں اتحاد کے ہیں وہ چمن ہے یہ
ہے روح جس کی جوہر ایماں وہ تن ہے یہ — شمع شعور جس میں ہے وہ انجمن ہے یہ

اس کا وجود باعثِ اعزاز قوم ہے
یہ بزمِ پاک انجمنِ ناز قوم ہے

اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ کلب کی ترقی ہو اور وہ اسکے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے ؎

یارب یہ بزم رنگ میں اپنے ہو یادگار — ایسی ہوا چلے کہ دلوں کا اُڑے غبار
یکجا ہوں جمع قوم کے ارباب نامدار — ذی علم و ذی لیاقت و ذی ہوش و ذی وقار

نیرنگیٔ نصیب کی پھر داستاں کھلے
اظہار مدعائے دلی کی زباں کھلے

کلب کی کارگذاریوں کا کیا اثر ہوا اور اس کے مقاصد کیا ہوں، اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے ؎

عبرت فزا ہو یاس کا افسانۂ کہن — قلب و جگر میں آتشِ پنہاں ہو شعلہ زن
ہے بیکسی سے قوم جو اک نقش بے کفن — عیسیٰ ہوں اسکے حق میں اراکین انجمن

دے جوش حبِ قوم دلوں کا سبق نیا
ہر دفترِ حیات میں اُلٹے ورق نیا

ہو دل سے دور گردشِ تقدیر کا ہراس
مردانہ وار غیرت و ہمت کا آئے پاس
باطل پسند جو ہیں نظر آئیں حق شناس
افسوں سے اتحاد کے ٹوٹے طلسم یاس

در بند ہو نفاق کا اُلفت کی راہ کھلے
اعجاز حبِ قوم سے دل کی گرہ کھلے

ابرِ کرم کا اشک ندامت کریں اثر
ہوں باغ قوم میں شجر خشک بارور
مُردہ دلوں میں سوز محبت کرے گذر
اُڑتے ہوئے دکھائی دیں اس راکھ سے شرر

بازار سرد مہریِ احباب سرد ہو
پیدا ہر اک کے دل میں محبت کا درد ہو

قائم کرے وہ رشتۂ الفت یہ انجمن
مضبوط پھر ہو قوم کا شیرازۂ کہن
ہر ایک کی زباں پہ ہوں جوش کے سخن
سب کی رگوں میں خون حمیت ہو موجزن

طبقہ اُلٹ دیں بختِ نحوست شعار کا
نقشہ بدل دیں گردشِ لیل و نہار کا

ان رپورٹوں کو دیکھنے کے بعد کلب کے مقاصد بالکل صاف اور واضح ہو جاتے ہیں۔ کلب دراصل کھیل کود کا کلب نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک اصلاحی تعلیم گاہ تھی، جہاں اس کے ہر ممبر کی زندگی کو سدھارنے اور بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش ہوتی تھی۔ چکبست مرحوم اس کلب کے "نقاد" کہلاتے تھے ان کی صحیح جگہ اور اختیارات کو سمجھنے کے لئے ہم اس رجسٹر سے پھر مدد لیتے ہیں جس میں واضح طور پر نقاد کے حقوق و فرائض کا ذکر کیا گیا ہے[۱]

رول نمبر ۱۳۔ "نقاد" کلب کا عمر بھر ممبر رہے گا۔
" ۱۴۔ کسی ناگہانی کے موقع پر نقاد جنرل باڈی کے ممبران کو مطلع کرے گا اور ان سے گفتگو کرے گا۔
" ۲۰۔ ایسوسی ایشن اور اس کی شاخوں کی نگہبانی کے واسطے نقاد

---

[۱] یہ ان رجسٹروں میں ہے جو گرٹو صاحب نے عنایت فرمایا۔

مقررہ ممبران میں سے ایک منیجر کا انتخاب کرے گا اور مندرجہ ذیل

کو نامزد کرے گا۔

(و) ایک نائب سکریٹری　　(ب) ایک فائنشیل سکریٹری

(پ) ایک نائب لائبریرین　　(ت) ایک نائب فائنشیل سکریٹری

(ج) ایک لائبریری منیجر　　(د) ایک نائب منیجر لائبریری

رول نمبر ۲۱ - اپنی غیر حاضری کی خاطر نقاد ایک نائب بھی مقرر کرے گا۔

〃 〃 ۲۲ - نقاد کو کسی انتظامیہ کمیٹی کا سابق افسر ہونا چاہیئے۔

کلب کے "نقاد" کے حقوق اور فرائض کا جائزہ لینے سے چکبست مرحوم کے اختیارات کا مکمل طور پر علم ہو جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ چکبست کلب کے روح رواں تھے۔ اور اس کی ہر کارروائی ان کے اشاروں پر ہوتی تھی۔ کلب کے مقاصد کا جائزہ لینے سے یہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ وہ ایک اصلاحی ادارہ تھا۔ کلب میں روز شام کو سب ممبر جمع ہوتے۔ ایک دوسرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر کسی کو کسی طرح کی مشکل پیش آتی تو اس کو بھی یہاں حل کیا جاتا۔ ہر ہفتہ ایک جلسہ ہوتا، جس کے لئے کوئی مضمون پہلے طے کر لیا جاتا۔ چکبست ان کی تقریروں کو سنتے اس کے بعد خود اپنے خیالات کا اس مسئلہ کے متعلق اظہار فرماتے اور ساتھ ہی ساتھ اگر ان نوجوان سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو اس کی اصلاح کرتے جاتے۔ ان جلسوں میں عام طور پر اس طرح کے مضامین لئے جاتے جو نوجوانوں کی اصلاح کیلئے مفید ثابت ہوں۔ مثلاً:۔

۱۰ رمئی ۱۹۱۴ء کے جلسہ کا مضمون زیر بحث تھا "کیرکٹر کا بننا"۔

۱۴ رجون 〃 کے جلسہ کا مضمون زیر بحث تھا "راجہ رام موہن رائے"

۲۶ رجولائی 〃 کے جلسہ کا مضمون زیر بحث تھا "کشمیریوں کا کردار"

۱۴ رمارچ ۱۹۱۵ء کے جلسہ کا مضمون زیر بحث تھا "ہندوستانی اسکولوں میں مادری زبان میں تعلیم"۔

۱۸ راپریل ۱۹۱۵ء کے جلسہ کا مضمون زیر بحث تھا "مشترکہ خاندان"

عام طور پر ہر سال کے شروع میں گذشتہ سال کی کارگذاریوں پر بحث ہوا کرتی تھی۔ اس کی خامیوں کا جائزہ لیا جاتا اور ان کی اصلاح کی کوشش ہوتی۔ لیکن کلب کی

۱۹۱۴ء کے بعد کی رپورٹیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ چکبست کلب کے کاموں سے مطمئن نہ تھے۔ اور شاید کلب کے ختم ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کلب کے ۱۵ فروری ۱۹۱۴ء کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے چکبست مرحوم نے جو فرمایا اس کے متعلق کول صاحب کا ارشاد ہے[۵]:۔

"پنڈت برج نرائن چکبست نے ہماری گذشتہ سال کی کارگذاریوں کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے کلب کے معاملات میں برتی گئی عام لاپرواہی پر روشنی ڈالی جو گذشتہ سال سے اتفاق سے زیادہ ہو گئی تھی۔ انھوں نے یہ کہا کہ کلب کی زندگی ہماری سوسائٹی میں ایک اخلاق وعیوب کی طاقتوں کی جدوجہد بن کر رہ گئی ہے۔ جب تک اخلاق کی فتح ہوتی رہی ہمارا کلب ترقی کی راہ پر گامزن رہا۔ لیکن جس ساعت سے بیہودہ۔ بے کار اور غیر سنجیدہ مقاصد نے اقتدار حاصل کر لیا اس وقت سے ہماری گذشتہ سالوں کی کارگذاریوں پر خاک پھر گئی۔ اور سارے ماحول کی خوبی اور پاکبازی ختم ہو گئی۔

انھوں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہمارے ممبروں میں سے اکثر کو ان احساسات کا احساس نہیں جو کلب ان پر کر رہا تھا۔ وہ اب بھی کلب کو ترقی کرتے دیکھنا ضرور چاہتے لیکن اس لئے انھیں کوئی فکر نہ تھی۔ اس کی وجہ ان کے جذبات اور ذوق وشوق کی کمی تھی۔ اسی کے ساتھ ان میں گہرے اثرات کی بے حد کمی تھی جو ایسوسی ایشن کی بہبودی میں اضافہ کرتی۔ اس کے بعد انھوں نے چند خوشگوار اور صحت مند تبدیلیوں کا ذکر کیا جو گذشتہ چند ہفتوں سے کلب کے بعض ممبران کے ذہن میں پیدا ہوئی تھیں۔ اور جس کے نتیجہ میں سالانہ جلسہ بے حد کامیاب رہا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اگر سب ممبران ان چیزوں پر قائم ہو گئے۔ اور ذوق وشوق میں ترقی ہوئی تو ہمارا مستقبل کافی درخشاں ہوگا۔"

لیکن دوسرے سال کی رپورٹ جو چکبست نے بہ حیثیت صدر جلسہ کے پیش کی اس سے

---

[۵] یہ تقریر کلب کی کارروائی کے ان رجسٹروں میں ملی گئی ہے جو گرتو صاحب نے عنایت فرمائے ہیں۔

ان کے دل کا مکمل طور پر ٹوٹ جانا ثابت ہوتا ہے۔ اور اسی چیز نے ان کو مجبور کیا کہ کلب سے دستبردار ہوجائیں۔ ان کے اس عمل نے کلب کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔ گرٹو صاحب لکھتے ہیں:[۱]

"صدر جلسہ نے ایک فصیح تقریر میں ایسوسی ایشن کی شروع سے آخر تک تاریخ بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانوں کو ان کے کالج و اسکول کے کام کی طرف نگاہ پیدا کرنے میں، مضمون نگاری اور مقرری سکھانے میں۔ ان کو بُری عادت جیسے قماربازی کو ترک کرنے کی تلقین کرنے اور عام طور پر عمدہ اخلاقی و ذہنی ماحول پیدا کرنے میں ایسوسی ایشن کی خدمت خصوصاً اس کے ابتدائی زمانہ میں بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ زوال پذیر ہوگئی۔ نوجوانوں کے چال چلن کو صحیح طریقہ پر ترقی دینے، ان کو زندگی کے بلند اور عالی خیالات پڑھنے اور جانچنے کی ترغیب دینے اور درحقیقت انکو روحانیت سے معترف کرنے کی کوشش ناکامیاب ہوگئی۔ اس کی ایک نمایاں دلیل ممبران کے آپس کے تعلقات میں نظر آتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی کسی دوسرے پر اپنا اخلاقی اثر ذرّہ برابر بھی نہیں ڈالا۔ ہر ایک اپنے دوست کی خامیوں و کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اسے خوف تھا کہ اگر وہ بالکل صاف گوئی پر آمادہ ہوگیا تو بدنام ہوجائے گا۔ اور اسے اپنے تمام دوستوں سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ممبروں نے اپنے اطوار و عادات میں ذرّہ برابر بھی ترقی نہ کی۔ عوام کی زندگی سے الگ رہنا ایک عام انداز بن گیا ہے۔ اور دوستی میں کوئی اخلاقی قوت نہ ہونے کی وجہ سے گھبراتے تھے۔ اگر ایک ممبر نے بھی اپنے اخلاق وعادات کو اثردار بنانے میں قدم آگے بڑھایا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا ورنہ اس ایسوسی ایشن کو زوال پذیر ہونے سے محفوظ رہنے کی بہت کم امید ہے۔"

یہ ہیں وہ خون کے آنسو جو چکبست کی آنکھوں سے اپنے ممبران کی لاپرواہی اور بے دلی کی وجہ سے نکل رہے تھے۔ اصلاح بھی کن کی جو سلطنت کی بربادی کے ساتھ ساتھ اپنی

---

[۱] ان رجسٹروں سے لی گئی جن میں کلب کی تفصیل ہے اور جو گرٹو صاحب نے عنایت فرمائے۔

ہر چیز کو برباد سمجھ بیٹھے تھے۔ جوا کھیلنا۔ شراب پینا۔ آوارگی کرنا۔ تعلیم کی طرف سے بے پروائی برتنا اور اسی طرح کے عیوب کو اپنا شعار بنا رہے تھے۔ چکبست نے ان کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا۔ ان سے قبل بھی بعض حضرات نے یہ کام شروع کیا تھا۔ جس کی جانب گذشتہ صفحات میں اشارے کئے جا چکے ہیں چکبست کو شروع میں اپنے ہم قوموں سے کافی مدد ملی۔ اور ان کو اُمید ہو چلی تھی کہ وہ اپنے اس اصلاحی عمل میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ سنہ ۱۹۱۲ء تک چکبست کلب کی ترقی سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ کیونکہ سنہ ۱۹۱۲ء میں کلب کے آٹھویں جلسہ میں نظم "درد دل" پڑھی تھی جس سے ان کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

قوم میں آٹھ برس سے ہے یہ گلشن شاداب ۔۔۔ چہرۂ گل پہ یہاں پاس ادب کی ہے نقاب
میرے آئینۂ دل میں ہے فقط اسکا جواب ۔۔۔ اسکے کانٹوں پہ کیا میں نے نثار اپنا شباب

کام شبنم کا لیا دیدۂ تر سے اپنے
میں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے

ہر برس رنگ پہ آتا ہی گیا یہ گلزار ۔۔۔ پھول تہذیب کے کھلتے گئے ٹوٹتے گئے خار
پتّی پتّی سے ہوا رنگِ وفا کا اظہار ۔۔۔ نوجوانانِ چمن بن گئے تصویرِ بہار

رنگِ گلُ دیکھ کے دل قوم کا دیوانہ ہوا!
جو تھا بدخواہِ چمن سبزۂ بیگانہ ہوا

بوئے نخوت سے نہیں یاں کے گلوں کو سروکار ۔۔۔ ہے بزرگوں کا ادب انکی جوانی کا سنگار
علم و ایماں کی طراوت کا دلوں میں ہے گزار ۔۔۔ دھو گئے چشمۂ اخلاق سے سینوں کے غبار

رنگ دکھلاتی ہے یوں دل کی صفا یاروں میں
روشنی صبح کی جس طرح ہو گلزاروں میں

گو کہ باقی نہیں کیفیتِ طوفانِ شباب ۔۔۔ پھنس کے جنجال میں دنیا کے یہ قصّہ ہوا خواب
مست رہتا ہے مگر اب بھی دلِ خانہ خراب ۔۔۔ شام کو بیٹھ کے محفل میں لنڈھاتا ہوں شراب

نشۂ علم کی اُمید پہ جینے والے
سمٹ آتے ہیں سرِ شام سے پینے والے

ایک طرف تو کلب کی یہ حالت ہے لیکن دوسری جانب قوم میں اب تک کوئی خاص فرق نمایاں نہیں اور شاید انھیں اثرات نے نوجوانوں کو اس قدر متاثر کر دیا کہ وہ کلب کے مقاصد سے برگشتہ ہو کر پھر بربادی کی طرف رجوع ہونے لگے۔ قوم کی حالت چکبست مرحوم اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

گلشنِ قوم میں ہے پیشِ نظر رنگ عجیب　　فتنے جاگے ہوئے ہیں خواب گراں میں ہے نصیب
دل محبت سے خفا ہیں تو مروّت کے رقیب　　دُور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں ہر وقت قریب

اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں
دل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں

کس کو دُکھ درد کی غیروں کی خبر رہتی ہے　　حالتِ اہلِ وفا نوع دگر رہتی ہے
رات دن عیش پرستی پہ نظر رہتی ہے　　ہوسِ دولت و زر شام و سحر رہتی ہے

نوجوانوں میں وہ اگلی سی محبت ہے کہاں
جو بزرگوں نے کمائی تھی وہ دولت ہے کہاں

کوئی سودائے محبت کا خریدار نہیں　　جوشِ اُلفت کی ذرا گرمیٔ بازار نہیں
پیٹھ کے پیچھے بُرا کہنے میں کچھ عار نہیں　　جو ہے رفتار خیالات وہ گفتار نہیں

فرق کیا ظاہر و باطن کا ہرا ہوتا ہے
جو زباں کہتی دل سُن کے اسے روتا ہے

دولتِ علم و ہُنر میں بھی نمایاں ہے زوال　　ہو رہا ہے چمنستانِ ذہانت پامال
سر میں سودا وہ نہیں جس سے میسر ہو کمال　　پڑھنے لکھنے کا فقط دولتِ دنیا ہے مآل

عمر یوں علم کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
اک تجارت ہے کہ دن رات چلی جاتی ہے

کفر ہے جوہر ذاتی کے لئے نشو و نما　　ذات انساں کی محبت ہے نہ ہے خوف خدا
سر مغرور سے ہے دور وفا کا سودا　　شان ظاہر کی تمنا ہیں دولت پہ فدا

جان سے شوقِ نمائش میں گزر جائیں ابھی
قبر چاندی کی جو مل جائے تو مر جائیں ابھی

یہ تھی قوم کی ۱۹۱۲ء کی حالت۔ چکبست نے جب اصلاح کی طرف قدم اُٹھایا تو شروع میں بزرگوں نے بھی ان کی ہمت افزائی کی لیکن ۱۹۰۵ء میں جب انھوں نے مذہبی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا تو بزرگ حضرات نے مخالفت شروع کردی۔ ان کا یہ قدم "رشی پیر" کے یگ کے خلاف تھا۔ یہ یگ کشمیر کے ایک فقیر کی یاد میں منایا جاتا تھا جن کو ہندو "رشی" اور مسلمان پیر کہتے۔ اسی وجہ سے ان کا نام رشی پیر ہوگیا۔ لکھنؤ میں یہ یگ سعادت گنج میں پنڈت راج نرائن بخشی کے باغ میں جس کا نام سیتلا باغ تھا، ہوا کرتا۔ شروع شروع میں صرف مذہبی رسوم ادا کرتے اور عام دعوت ہوتی لیکن جلد ہی کج روی اور بداخلاقی کے اثرات بڑھنے شروع ہوگئے اور اب بجائے مذہبی رسوم کے ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ تمام کشمیری پنڈتوں سے اس کے لئے چندہ جمع کیا جاتا اور ان کو مذہبی فریضہ بنا کر شرکت پر مجبور کیا جاتا۔ چکبست نے یہ رنگ دیکھ کر اس کی مخالفت شروع کی۔ ان ساتھیوں نے یگ میں چندہ دینے اور شرکت کرنے سے انکار کردیا۔ اور اس کی اس قدر مخالفت کی کہ آخر ۱۹۰۶ء میں یہ یگ نہ ہوسکا۔ اور اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

غالباً کلب کے ممبران کی لاپرواہی اور اپنے پیشہ وکالت کی مصروفیت نے چکبست کو ۱۹۱۶ء سے اس قدر مجبور کردیا کہ وہ کلب سے قریب قریب الگ ہوگئے۔ ان کا الگ ہونا تھا کہ کلب ختم ہوگیا۔ اکثر کلب کے ممبران نوکری کے سلسلہ میں باہر بھی چلے گئے تھے۔ چکبست خود کشمیری محلے کی سکونت ترک کرکے گولہ گنج لکھنؤ میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ ان حالات نے اس شیرازہ کو بالکل منتشر کردیا جو ۱۹۰۴ء میں قائم ہوا تھا۔

کلب کے ختم ہونے کے باوجود ان کا جو اصلاحی جذبہ تھا وہ نہ دبا۔ جس کا صحیح پتہ ان کی مشہور نظم "نالۂ یاس" سے ہوتا ہے۔ یہ نظم ۱۹۱۷ء میں لکھی گئی ہے۔ صاف الفاظ میں کہتے ہیں ؎

بے خبر اب بھی نہیں ہم قوم کے دُکھ درد سے
پہلے ہمت تھی دوا کی اب دعا کہنے کو ہیں

اس کے بعد کے جو شعر اس نظم کے ہیں دراصل خون کے آنسو ہیں جو شعر کی شکل میں
کاغذ پر ثبت ہوئے ہیں ؎

وہ بھی کیا عالم تھا جب دنیا سے دل آزاد تھا ۔۔۔ اور سب بھولے تھے ایک قصۂ وفا کا یاد تھا
قوم کا سودا وفا کا شوق خدمت کی اُمنگ ۔۔۔ بس انھیں دو تین کے صدقے میں دل آباد تھا
کوفت تھی ہم کو اگر گمراہ تھا بچہ کوئی ۔۔۔ ہم بھی خوش تھے گر کسی معصوم کا دل شاد تھا
تھی اسی رنگِ محبت سے اُمیدوں کی بہار ۔۔۔ کیسے کیسے پھول تھے کیسا چمن آباد تھا

ہم یہ برسوں کی محبت بھولنے والے نہیں
اتنے بھائی ایک ماں کی گود نے پالے نہیں

حیف یہ مجموعۂ صحبت پریشاں ہوگیا ۔۔۔ بستیوں میں پھول پہونچے باغ ویراں ہوگیا
مل گیا اہلِ چمن کو پھر بھی خدمت کا صلہ ۔۔۔ قوم کا دامن کسی گل چیں کا داماں ہوگیا
رنگ تاثیرِ چمن بکھرے ہوئے پھولوں میں ہے ۔۔۔ کیا ہوا خالی اگر صحنِ گلستاں ہوگیا
ہم جہاں ہیں انجمن کی وضع اپنے ساتھ ہے ۔۔۔ جس جگہ پہونچے وہی عالم نمایاں ہوگیا
غنچۂ احباب کی تصویر ہے سینے کے ساتھ ۔۔۔ دل کی ہر بستی میں ایک محفل کا ساماں ہوگیا

نشہ سے غافل ہمارے رند اور ساقی نہیں
گو کہ محفل اُٹھ گئی جام و سبو باقی نہیں

گو کہ اگلے باغباں جنجال سے چھوٹے نہیں ۔۔۔ پھر ابھی اس باغ کے دیوار و در ٹوٹے نہیں
انتظارِ شوق میں در پر کھڑی ہے نو بہار ۔۔۔ پیشوائی کیلئے پھل پھول گل بوٹے نہیں
یاس کہتی ہے کہ جمنے کا نہیں رنگِ چمن ۔۔۔ آرزو کہتی ہے اگلا سلسلہ ٹوٹے نہیں

آپ اگر پیغام دیں بادِ بہاری کے لئے
آئیں گے اہلِ چمن پھر آبیاری کے لئے

اصلاح کا یہ جذبہ دب نہ سکا، بلکہ پیشہ کی مصروفیت اور وقت کی کمی کے باوجود نیا
رنگ لایا۔ اور آخرکار انھوں نے اس مقصد کی ترویج اور تکمیل کے لئے اکتوبر ۱۹۱۸ء
سے ایک رسالہ صبحِ امید نکالنا شروع کر دیا۔ اس کے ایڈیٹر وہ خود تھے۔ یہ رسالہ
کشن پرشاد کول کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ لیکن ۱۹۱۸ء کے چکبست ۱۹۰۷ء کے
چکبست سے مختلف تھے۔ اب ان کا اصلاحی قدم گھر سے باہر نکل چکا تھا۔ اب یہ اصلاح

صرف کشمیری پنڈتوں کی اصلاح نہ تھی، بلکہ ملک و قوم کی اصلاح کی طرف عملی قدم تھا۔ رسالہ کے مسلک کے متعلق پہلے شمارہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"عزیزان وطن اس انقلاب کے دور میں بہتی ہوئی گنگا کے ساحل پر صبح امید کی نووارد کشتی نمودار ہوتی ہے۔ وطن کی محبت اس کی ناخدا ہے اس کے بادبان آزادی اور جمہوریت کی ہوا کو اپنے دامن میں لینے کے لئے تیار ہیں۔ قوم و ملک کی خدمت اس کا مسلک ہے اور محبانِ وطن کی قبول خاص اس کی منزل مقصود ہے۔ لیکن قومی خدمت کے مسلک سے ہٹ کر محض نمود و نمائش کی ہوا کے رخ کے ساتھ بہنا اسکی روش سے دور ہے۔

عزیزانِ وطن یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نئی امنگوں کی طغیانی کا عالم دیکھتے ہوئے اخلاقی، سوشل اور پولیٹکل قوتوں کا ترتیب دینا اور آراستہ و پیراستہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ تھوڑے دنوں پہلے خادمان قوم کے راستے میں یہ دشواری حائل تھی کہ پرانی لکیر کے فقیر اپنی جگہ سے ہٹنا کفر سمجھتے تھے۔ زمانہ کی گردش نے اس پرانے طلسم کو ضرور توڑ دیا ہے۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ کے خیالات کا مرکز ضرور بدل گیا ہے، تاہم ہماری نوآموز طبیعتیں اکثر اصلی جوہر اور مصنوعی نمائش میں امتیاز کرنے میں مجبور نظر آتی ہیں۔ ہم نئے خیالات کی ہوا میں ضرور اُڑتے ہیں مگر اپنی موجودہ حالت کو نئے اصولوں کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتے۔ محض خیالات کی تازگی پر ناز کرنا ہم اپنے لئے باعثِ ناز سمجھتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ خیالات کا مرکز بدلنا اس وقت تک زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک ہم روزمرہ کی زندگی کے تاریک گوشوں میں نئی روشنی کی شعاعیں نہ پہونچا سکیں۔ اس وقت ملک میں قومی یگانگت، آزادی، جمہوریت اور وطن پرستی کے نعرے ہر طرف بلند ہو رہے ہیں اور کون ایسا بے دل ہوگا جو اس بیداری کے رنگ کو دیکھ کر خوش نہ ہوگا، مگر دُور اندیش اور جوہر شناس نگاہوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے، کہ اکثر حالتوں میں یہ روحانی اُمنگیں محض زبان کی نمائش کے رنگ میں گرفتار

رہتی ہیں اور ابھی تک ہمارے خون میں شامل نہیں ہوئی ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ ذات کی پابندی سے عاجز ہے۔ کھانے پینے کے قیود نے جو زنجیر معصوم خدا کے بندوں کو پہنا رکھی تھیں وہ ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا قومی یگانگت اور سوشل آزادی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مگر دلوں کا خدا حافظ ہے۔ کثرت سے ایسے بدنصیب اہلِ وطن ملیں گے جن کے سروں میں ابھی یہ سودا باقی ہے کہ ہم کانستھ ہیں، کشمیری برہمن ہیں۔ کھتری ہیں، یا ویش ہیں، اور دوسرے فرقہ کے لوگ ہمارے مقابلے میں اخلاقی حیثیت سے کم وقعت ہیں۔ جب تک اس قومی غرور کا سانپ دلوں میں لہریں مارتا رہے گا اس وقت تک محض ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہونے سے یا قومی یگانگت کا راگ گانے سے بدنصیب قوم کے پیروں سے ذات کی تفریق کی بیڑیاں نہیں کٹ سکتیں۔[۱]

اسی اداریتی نوٹ میں عورتوں کے مسئلہ کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے جسے انھیں کے الفاظ میں پیش کرنا زیادہ مناسب ہوگا:۔

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ بھی اس رنگ سے خالی نہیں ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان کالج کے ایوان سے مل (Mill) کے فلسفہ کی ہوا میں اڑتے ہوئے نکلتے ہیں۔ اور بعض برنڈ شاہ (کذا) تک کا دامن چھو آتے ہیں۔ یہ آزادی اور اصلاح کے فرشتے جلسوں اور کانفرنسوں میں معصوم اور بے گناہ عورتوں کی حسرت ناک حالت کی تصویر الفاظ کی رنگ آمیزی سے اس طرح سے کھینچتے ہیں کہ دیکھنے والے اور سننے والے مسکرا مسکرا کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر روزمرہ کا تجربہ بتلاتا ہے کہ ان حامیانِ آزادی کی زبان سے کتنا ہی امرت کیوں نہ ٹپکے مگر ان کے دلوں میں بدگمانی کے زہر میں بجھے ہوئے تیر و نشتر پوشیدہ ہیں۔ انھیں عورتوں کی ذات میں اعتبار نہیں۔ فارسی شاعر کے مقولہ میں ان کا عقیدہ باقی ہے کہ ؎

"اسپ زن و شمشیر، وفادار کہ دید"

---

[۱] رسالہ صبح امید اکتوبر ۱۹۱۸ء اڈیٹر پنڈت برج نرائن چکبست

اور وہ ابھی تک عورت کو نسل انسانی کا جزو ادنیٰ سمجھتے ہیں۔ عورتوں کو نمائش کا کھلونا بنا کر پردے سے باہر نکالنا رواج میں داخل ہو گیا ہے لیکن وہ دردمند اور انصاف پسند دل ابھی پیدا نہیں ہوئے جن میں عورت کی پاک اور روحانی ذات کی سچی وقعت گھر کر سکے۔ اور ان آنکھوں پر خود غرضی اور تعصب کی نقاب پڑی ہوئی ہے جن کو ان معصوم فرشتہ کی پیشانی کے آئینہ میں دنیا کی نیکی اور حسن کا عکس نظر آنا چاہیئے — پولٹیکل آزادی اور جمہوریت کے جذبات بھی مصنوعی آرائش کے اثر سے پاک نہیں ہیں۔

صبح امید کا دائرہ کس قدر وسیع تھا وہ پہلے ہی شمارہ کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر رسالہ یا اخبار ابتدا میں اپنے مقاصد و اغراض کا ذکر کرتا ہے اسی طرح چکبست نے بھی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوستان کی قومی تحریک کو حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے جس سے ان کے سیاسی اور اصلاحی خیالات بالکل واضح ہو جاتے ہیں :-

مسٹر گاندھی کے ایسے فدائیان قوم نے ملک کی نگاہوں کے سامنے جو وطن پرستی کا بلند معیار قائم کیا ہے اس پر ہندوستان کی سرزمین کا ذرہ ذرہ ناز کر سکتا ہے۔ ایسے بزرگوں کے قدموں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عام طور پر آزادی اور جمہوریت کے اصلی اصول ہمارے دلوں پر ابھی پورے طور سے نقش نہیں ہوئے ہیں۔ قومی خدمت کی راہ کی پہلی منزل یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی کو قومی ہستی پر نثار کرنے کے لئے تیار ہو۔ اور اپنے دل و دماغ کو تسلیم و تجربہ کے جوہروں سے آراستہ کر کے وطن پرستی کے لئے وقف کر دے، جو مرد خود اس دشوار گذار راستہ پر چلتے ہیں۔ اور وطن کے نام پر فقیری لئے ہیں۔ انھیں برسوں کی خدمات اور ریاضت کے بعد یہ صلہ نصیب ہوتا ہے کہ زمانہ ان کے سر پر ملک و قوم کی سرغنائی کا تاج رکھتا ہے، اور دنیا ان کی پرستش کرتی ہے۔ تلک۔ گوکھلے۔ سر سید احمد خاں۔ سریندر ناتھ، مالوی وغیرہ

ایسے نام ہیں جن کی روشنی سے وطن کی محبت کا نام روشن ہے۔ مگر
اس وقت ہماری نگاہوں کو دوسرے قسم کا نظارہ ستا رہا ہے۔ جمہوریت
اور آزادی کے شیدا اختلاف رائے کا تازیانہ برداشت نہیں کر سکتے
ہر طفل مکتب جس کی زبان میں ذرا بھی روانی ہے یا جو اپنے علم کو ذرا بھی گردش
دے سکتا ہے یہ اعلان کرنے کو تیار ہے کہ وہ قوم کا سردار ہے، اور قوم کے
خادم کی حیثیت سے عمر گذارنے میں اسے فرصت نہیں ہے۔ قبول عام کا یہ
سودا یہ اجازت نہیں دیتا کہ عوام کے توہمات و غیر سنجیدہ جذبات کی اصلاح
کو زبان پر لایا جائے۔ نوجوان ترک ادب کو حب الوطنی سمجھتے ہیں۔ پولٹیکل
تعلیم اور تجربہ کی روشنی اور درستی کے پھول کی جگہ باقی نہیں رہتی۔ جن
فدائیان قوم نے اپنی تمام عمر ملک و قوم کی خدمت میں صرف کر دی انکے
سپید بالوں پر فریب و ریا کاری کی سیاہی پھیرنے میں تکلف نہیں کیا
جاتا۔ اور تماشا ہے کہ یہ تمام شورشیں وطن پرستی اور جمہوریت کے پردے
میں برپا کی جاتی ہیں۔ ان خامیوں کو دیکھتے ہوئے عزیزانِ وطن اور قومی
یگانگت۔ آزادی جمہوریت اور وطن پرستی کے پاک روحانی اصولوں
پر جو مصنوعی نمائش کے پردے پڑے ہوئے ہیں ان کے اٹھانے کی کوشش
کریں۔ "صبح امید" کی ہستی کا تقاضا صرف اسقدر ہے کہ وہ اس نیک
کوشش کے پورا کرنے میں عزیزانِ وطن کی خدمت ادب اور آزادی
کے ساتھ انجام دے ؎۱"

اس رسالہ کے مقاصد کا جائزہ لینے سے یہ بات صاف طور پر نمایاں ہو جاتی ہے کہ
چکبست اب کشمیری پنڈتوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی طرف بھی رجوع
ہو رہے ہیں۔ سیاست۔ سماجی حالات اور جمہوریت کا ایک خاص خاکہ دماغ میں پیدا
ہو چکا ہے۔ اب ان کی اصلاح دوسرے ڈھنگ کی ہے۔

بیوہ کی شادی کا مسئلہ ہندو قوم میں ایک اہم مسئلہ رہا ہے لیکن کشمیریوں
میں آج تک صرف ایک ایسی شادی کا پتہ چلتا ہے۔ جو ۱۹۱۶ء میں آگرہ میں ہوئی۔

؎۱ رسالہ صبح امید اکتوبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۱ تا ۳۔ اڈیٹر برج نرائن چکبست

یہ شادی پنڈت کنور پرشاد کول نے پنڈت موہن کشن ٹنخاہ کی بیوہ کے ساتھ کی تھی جیسا کہ ۱۰/ اگست ۱۹۱۶ء کے لیڈر اخبار کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے۔ اس خط کا عنوان ہے "ایک کشمیری بیوہ کی شادی" جس میں تحریر ہے:-

"گذشتہ چند سالوں میں ہندو سماج میں بیواؤں کی شادی کے واقعات ہوئے ہیں لیکن کشمیریوں میں جو کہ اور بھی زیادہ قدامت پسند معلوم ہوتے ہیں ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے۔ اس طرف اب تک ایک زبردست تحریک ہوئی ہے۔ ہم پنڈت شرکا پرشاد کول کے بیٹے پنڈت کنور پرشاد کول کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے پنڈت موہن کشن کی بیوہ سے شادی کرنے کا پہلا، مضبوط قدم اٹھایا ہے۔ باوجودیکہ وہ تمام رکاوٹیں اور نامناسب حالات جو کہ ہمیشہ سماج کے مصلح کے سامنے آیا کرتے ہیں ان کے سامنے بھی آئے۔ ہم جناب کول کی اور بھی زیادہ تعریف کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک بہت ضروری سماجی اصلاح کی بنیاد رکھی۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس جوڑے کے والدین اور رشتہ دار اس رشتے کے شدید مخالف تھے لیکن طرفین کے مستحکم ارادہ کو دیکھ کر انھوں نے مجبوراً اجازت دیدی حالانکہ انھوں نے جشن میں شرکت نہیں کی۔ ضرورتاً پنڈت ارجن ناتھ ٹکرو اور ان کی والدہ نے دولھا کے والدین کی حیثیت سے مذہبی رسوم ادا کئے اور پنڈت گوپی ناتھ کندرو نے اپنی چچی زاد بھابھی پنڈت وسوناتھ کندرو کی بیوی کے ساتھ دلہن کی طرف سے والدین کے فرائض انجام دیے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ آگرہ کے اکثر کشمیری اس بہادر جوڑے کے ہمرکاب رہتے اور انھوں نے مشکلات پر آسانی و اطمینان سے قابو حاصل کرنے میں مدد دی۔ جو کہ لکھنؤ میں قطعی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی جہاں اس جوڑے نے پہلے جاکر اس مسئلہ میں مدد چاہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ شہر اور بھی زیادہ کٹر اور تنگ نظر ہے...

... ایک بہت ہی اچھی اور بڑی تعداد میں باہر کے لوگوں کو مدعو

بھی کیا گیا تھا۔ جس میں سے کچھ حضرات نے شرکت کی جب کچھ نے اپنی
مجبوری ظاہر کی لیکن مکمل ہمدردی اور اصلاح اور ہر طرح سے انکو
دلچسپی ظاہر کی۔ ان حضرات میں بعض حضرات کا نام لیا جاتا ہے۔
پنڈت منوہر لال زتشی۔ پنڈت برج نرائن چکبست اہم حضرات ہیں
یہ شادی تمام کشمیری رسومات کے ساتھ ساتھ پنڈت گلشن ناتھ کنزرو
کے خوبصورت پائیں باغ میں گذشتہ ماہ کی دس تاریخ کو ہوئی تھی"

ایک انسان

پنڈت کنور پرشاد کول اور بیوہ پنڈت موہن کشن دونوں آگرہ سے لکھنؤ آئے
اور یہاں انھوں نے کشمیری پنڈتوں سے مدد چاہی۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ کسی طرح
سے شادی لکھنؤ میں ہو جائے جس سے آسانی بھی ہوگی۔ اور مخالفت بھی کم ہوگی۔
لیکن لکھنؤ کے پنڈت باوجود ان سے ہمدردی رکھنے کے ان کی شادی آگرہ میں ہونے
کے موئید تھے۔ مجبوراً وہ آگرہ واپس گئے یہاں ۱۰ ستمبر ۱۹۱۶ء کو شادی ہوئی۔
چکبست مرحوم شادی میں شرکت نہ کر سکے۔ لیکن ایک نظم "برق اصلاح" لکھ کر
بھیجی جس سے ان کی ہمدردی اور جذبات کا مکمل پتہ چلتا ہے۔ غور کیجئے کہ نظم کو کن
الفاظ سے شروع کرتے ہیں ؎

مرحبا جرأتِ اصلاح دلانے والو | قوم کے بارِ امانت کے اٹھانے والو
دل کی اُجڑی ہوئی نگری کے بسانے والو | مادرِ ہند کی بگڑی کے بنانے والو

کیسے طوفاں میں دیا ہے یہ سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو اُبھارا تم نے

گل جسے عین لطافت میں خزاں نے لوٹا | آج اس باغ کا شاداب ہے بوٹا بوٹا
بیڑیاں کٹ کے گریں قفلِ اسیری ٹوٹا | چاند معصوم کی قسمت کا گہن سے چھوٹا

تم بھی خود شاد ہوئے قوم کو بھی شاد کیا
دل کے ویران شوالہ کو پھر آباد کیا

آگے چل کر نوشہ اور دلھن کو جن الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں وہ ان کے جذبات کا صحیح
آئینہ ہے ؎

قوم میں گلشنِ اصلاح پڑا تھا ویراں — طائرِ باغ تھے بے بال و پری سے نالاں
ہوگیا اور ہی قدموں سے تمھارے سامان — ایسے دل سوز چمن بند میسّر ہیں کہاں
قوم دیتی ہے دعا نام تمھارا سن کر
راستہ صاف کیا باغ سے کانٹا چن کر

بے گنہ ظلم سے ہو جاتے ہیں اکثر معذور — مگر انصاف کا دربار بھی ہوتا ہے ضرور
قوم کے جبر کا لیکن ہے نرالا دستور — یہ ہو پابندِ جہالت تو ہے دنیا مجبور
دل تو کیا رُوح بھی اس قید سے آزاد نہیں
یہ ہے وہ ظلم کہ جس کی کہیں فریاد نہیں

آج اس ظلم کی بنیاد ہلی جاتی ہے — خاک میں حجتِ دیرینہ ملی جاتی ہے
رحم کا راج ہے اب سنگ دلی جاتی ہے — یاں کلی دل کی محبت سے کھلی جاتی ہے
مرد قوموں کو سبق یوں ہی سکھا دیتے ہیں
دل میں جو ٹھانتے ہیں کر کے دکھا دیتے ہیں

یہ شادی تو ہوگئی لیکن اس کے بعد دو گروہ پیدا ہوگئے ایک دن ان کے ہمدرد جو اس شادی کو باعثِ فخر اور قوم کے ایک مسئلہ کو حل بتاتے تھے، دوسرے اس کے مخالف جو اس کو قوم کی بربادی کہتے تھے، دونوں حضرات کی اخباری جنگ شروع ہوئی۔ تمام خطوط لیڈر اخبار میں شائع ہوئے جنکی تعداد چودہ ہے اور تاریخیں ۱۰ راگست۔ ۲۵ راگست۔ ۲۷ راگست۔ یکم ستمبر کو تین عدد خطوط۔ ۲ ر ستمبر کو بھی ۳ خطوط۔ ۴ ر ستمبر۔ ۱۱ ر ستمبر۔ ۱۵ ر ستمبر۔ ۱۶ ر ستمبر۔ اور ۱۸ ر ستمبر ۱۹۱۶ء ہیں۔ ۲۷ ر اگست کو جو خط شائع ہوا اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ والے اس شادی سے زیادہ خوش نہ تھے اور انھوں نے اس میں مدد نہ دی تھی۔ خط کا مضمون ہے :-

"یہ افسوس اور شرم کی جگہ ہے کہ جس لکھنؤ نے کشمیری خاندان کو پنڈت بشن نرائن در اور پنڈت پریم ناتھ گولیاری جیسے مصلحِ قوم دیے جن کا نام عموماً آئندہ انڈین سوشل کانفرنس کی خدمات کے لئے لیا جاتا ہے وہ لوگ دقیانوسی خیالات کا اب بھی قلعہ بنائے ہوئے ہیں۔ پنڈت منوہر لال زتشی اور پنڈت برج نرائن چکبست جیسے لوگوں کو جنکے سوشل ریفارم تعارف کے محتاج نہیں یہ

الزام لکھنؤ کے اوپر سے اُٹھانا چاہیئے۔ کم سے کم اگر وہ کوئی مدد ان حضرات کی نہیں کر سکتے تو یہ تو کریں کہ اس کام پر اپنی رضامندی ظاہر کریں۔"

ایک آزاد خیال

یہ لکھنؤ والوں پر کھلا ہوا اعتراض تھا۔ لکھنؤ والے کبھی بھی اور خاص طور پر چکبست مرحوم اس شادی کے مخالف نہ تھے بلکہ ان حضرات کی دلی خواہش تھی کہ اس طرح کی شادیاں عام ہوں، جیسا کہ پنڈت برج کشن گرٹو صاحب کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے اس موقع پر اخبار میں شائع کیا:-

"جناب عالی! اگر آپ کے اخبار مورخہ ۲۷ راگست میں یہ خط نہ شائع ہوا ہوتا جو ایک آزاد خیال شخص کا لکھا ہوا ہے، تو میں اس موضوع پر کبھی نہ لکھتا۔ اس خط میں کشمیریوں سے ایسے خیالات منسوب کئے گئے ہیں جو کہ انکے عقائد کے بالکل خلاف ہیں۔ آپ کے نامہ نگار خصوصی نے لکھا تھا کہ لکھنؤ کے کشمیری کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے ہیں اور اصلاح میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ میں "آزاد خیال حضرت" اور ان کے دوستوں کو بتلا سکتا ہوں کہ لکھنؤ کے کشمیری تحریک سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور وہ اس میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ اپنی تحریر کے ثبوت میں میں "آزاد خیال حضرت" اور ان کے دوستوں کے سامنے ایک اور حقیقت پیش کر سکتا ہوں کہ پنڈت منوہر لال زتشی اور پنڈت برج نرائن چکبست۔ پیارے لال چک ڈپٹی کلکٹر اور برج کشن ٹوپا منصف اور لکھنؤ سے متعلق تمام لوگوں نے مسٹر اور مسز کول کو مبارک باد اور ہمت افزائی کے پیغامات بھیجے ہیں۔ کشمیری ینگ مین ایسوسی ایشن کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغام سے صاف ظاہر ہی ہے۔

یہ تمام باتیں لکھنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ غلط فہمیاں دُور ہوں اور تمام حضرات پر واضح ہوجائے کہ لکھنؤ میں اس سے ذرا بھی اختلاف نہیں ہے اور یہاں مسٹر اور مسز کول کو برادری سے نکالنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔"

"برج کشن گرٹو"

اس خط سے لکھنؤ والے حضرات پر جو اعتراض ہوتا تھا کم ہو گیا اور اسکے بعد چند

اور خطوط نکلنے کے بعد یہ اخباری جنگ ختم ہوئی لیکن آج تک کسی دوسری بیوہ کی شادی نہ ہوسکی۔ لوگوں نے اکثر و بیش تر مضامین لکھے اور کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ خود چکبست نے اپنے رسالہ صبح امید کے پہلے ہی نمبر میں جو اکتوبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا "ہمارے معاصرین" کے تحت رسالہ زمانہ کے ایک نقشہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے [۱]

---

[۱] رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۱۸ء میں ہندو بیواؤں کی افسوسناک تعداد کا ایک نقشہ شائع ہوا ہے، جو "پنجاب بدھوا بواہ سہایک سبھا لاہور" نے تیار کیا ہے نقشہ مندرجہ ذیل ہے :-

تفصیل ممالک	کل تعداد ہندو بیوگان	ایک سال کی عمر	ایک سے دو سال کی عمر	دو سے تین سال کی عمر تک	تین سے چار سال کی عمر تک	چار سے پانچ سال کی عمر تک	پانچ سے دس سال کی عمر تک	دس سے پندرہ سال کی عمر تک	۱۵ سے ۲۰ سال تک	۲۰ سے ۲۵ سال تک	۲۵ سے ۳۰ سال تک	۳۰ سے ۳۵ سال تک
آسام	۲۴۹۹۴۴	.	.	.	۱	۴	۲۲۰	۱۹۰۸	۷۹۱۸	۲۴۶۴۶	۲۵۸۰۲	۲۹۱۶۲
بنگال	۸۰۳۰۳۲۵	۵	۱۶	۴۶	۲۰۸	۴۲	۸۳۳۸	۲۸۰۳۱	۹۵۱۴۸	۱۲۰۲۹۲	۱۸۳۰۹	۱۱۵۸۴
بہار واڑیسہ	۱۰۸۸۸۸۲	۳۸۹	۱۹۹	۴۶۲	۱۳۵۹	۲۳۱۲	۲۲۳۸۷	۸۱۳۲۲	۵۰۰۵۰	۸۲۵۸۷	۱۳۲۸۶۲	۱۵۹۰۳۲
بمبئی	۹۸۶۹۲۳	۸۱	۸۲	۱۰۶	۲۴۹	۲۸۱	۶۸۶۶	۱۵۳۲۴	۱۲۶۵۷	۳۰۵۹۰	۴۲۶۲۳	۱۱۲۵۴۰
وسط ہند	۴۳۴۹۹۹	۱۵	۱۵	۱۲۵	۳۳۱	۳۳۱۲	۳۰۳۹	۱۱۵۵	۲۳۸۳۲	۱۹۱۸۹	۲۴۸۰۵	۳۹۱۱۳
مدراس	۱۰۱۵۸۰۶	۳۳	۳۳	۸۵	۱۳۳۴	۱۳۸	۳۲۸	۲۹۶۴	۸۲۳۸۱	۵۱۰۴۲	۱۲۱۵۱۱	۹۰۲۳۰
شمالی مغربی صوبہ سرحدی	۲۷۹۶	.	.	.	.	.	۵	۱۶	۹۸	۲۵۵	۵۰۶	۴۳۶
پنجاب	۳۰۹۰۸	۲	.	۶	۱۲	۷	۱۲۵۹	۲۳۳۴	۹۱۶	۱۲۶۹۳	۲۴۹۱۱	۴۱۲۲۵
صوبجات ممالک متحدہ	۱۳۶۲۳۵۴	۱۱۳	۷۰	۱۵۱	۱۵۱	۴۰۲	۱۴۰۹۹	۳۸۲۶۹	۲۹۵۵۵	۱۰۱۳۴۲	۱۵۰۰۰۴	۲۲۴۹۵۵

اس نقشہ کو دیکھ کر بھی اگر ہمارے ہندو ہم وطن کو اپنی قومی زندگی پر افسوس اور شرم نہ آئے تو انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اتنے بے گناہ بندگان خدا کی آہ و بکا کا طوفان قوم کا سفینہ ڈبونے کیلئے کافی ہے۔ انھیں یاد رکھنا چاہیئے سہ

ستانہ خاطر مظلوم کو ڈرلے قاتل
پڑے نہ تیغ کبھی جیسے آہ پڑتی ہے

چکبست نے برابر اس طرح کی کوشش کی کہ ہندوؤں میں بیوہ کی دوسری شادی کا عام رواج ہو جائے۔ لیکن نہ تو ان کی حیات میں اور نہ آج تک یہ مسئلہ اس طرح سے حل ہو سکا جو ان کی آرزو تھی۔

چکبست لڑکیوں کی تعلیم کے قائل تھے اور ان کی بڑی آرزو تھی کہ ہندوستان کی لڑکیاں ترقی کریں لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ لڑکیاں حد سے زیادہ آزاد ہوں اور بے پردگی کا غلط استعمال کریں "پھول مالا" نظم میں قوم کی لڑکیوں سے خطاب کرتے ہوئے ان کو صلاح دیتے ہیں ؎

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم — تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے — خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
رنگ و روغن تمھیں یورپ کا مبارک لیکن — قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز
رُخ سے پردہ کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز
تم کو قدرت نے بخشا ہے حیا کا زیور — مول اس کا نہیں قاروں کا خزانا ہرگز
دل تمھارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لئے — اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز

یہ وہ اصلاح ہے جس کو لڑکیاں لڑکیوں کی طرح زندگی گزار کر پورا کر سکتی ہیں۔
اس کے بعد ان کے اس زبردست کام کو یاد دلاتے ہیں جو ان کو ماں بن کر سر انجام دینا ہے۔ اس نظم کے دوسرے حصہ میں تحریر فرماتے ہیں ؎

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو — دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے — راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز
پرورش قوم کی دامن میں تمھارے ہوگی — یاد اس فرض کی دل سے نہ بھلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمھارے نہ ہو اس وقت کا رنگ — ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رلانا ہرگز
ہوگا پرلے جو گرا آنکھ سے ان کی آنسو — بچپنے سے نہ یہ طوفان اٹھانا ہرگز

؎ پرلے معنی قیامت

ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں — تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز
کس کے دل میں ہے وفا کس کی زباں میں تاثیر
نہ سُنا ہے نہ سنو گی یہ فسانا ہرگز

یہ نظم ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی ہے اس کے علاوہ ۱۹۱۶ء کے لکھے ہوئے چکبست کے دو خط مجھے دستیاب ہوئے جن سے لڑکیوں کے باہر نکلنے پر ان کی آزادی کے متعلق ان کے خیالات کا مکمل پتہ چلتا ہے۔ یہ دونوں خط پنڈت برج کشن گرٹو کے نام ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں گرٹو صاحب لکھنؤ سے الٰہ آباد وکالت کی تعلیم حاصل کرنے گئے۔ الٰہ آباد کے کشمیری لکھنؤ کے کشمیریوں کے مقابلے میں زیادہ آزاد خیال اور نئی روشنی کے پیرو تھے۔ لکھنؤ کے کشمیری ابھی اتنے آزاد نہ تھے کہ ان کے یہاں سے پردے کا رواج ختم ہو یا لڑکیاں غیر کشمیری مردوں کے ساتھ گھومیں پھریں۔ گرٹو صاحب الٰہ آباد کی کشمیری لڑکیوں کی یہ آزادی دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے رسالہ "استری درپن" میں ایک مضمون "ہمارے سماج میں کیا دوش ہیں" کے عنوان سے لکھا جس میں ان آزادیوں پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ چکبست مرحوم نے جب یہ مضمون دیکھا تو انھوں نے فوراً ایک خط گرٹو صاحب کو لکھا۔ اس کے بعد گرٹو صاحب نے جواب دیا جس کا پھر جواب چکبست نے دیا۔ چکبست کا پہلا خط ۷ / فروری ۱۹۱۶ء کا اور دوسرا ۲۰ / فروری ۱۹۱۶ء کا ہے۔ پہلے خط میں چکبست صاحب فرماتے ہیں:-

"پیارے برجو

الٰہ آباد جانے پر مجھ سے سورج اور شنکر ناتھ سے تمھارے استری درپن میں شائع ہونے والے مضمون کے بارے میں گفتگو ہوئی جو میں نے اس وقت تک نہیں پڑھا تھا۔ میں نے لکھنؤ کی واپسی پر اس کو پڑھا اس سے معلوم ہوا کہ لہجہ اور اسپرٹ دونوں کے لحاظ سے بہت زیادہ قابل اعتراض ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس کے متعلق تم سے گفتگو کروں۔ چونکہ ہم لوگ ایک جگہ نہیں اور نہ میں تم سے اس بات پر جھگڑا کرنا چاہتا ہوں مگر ساتھ ہی اس بات کا اظہار کر دینا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ بات تمھارے لئے بہت زیادہ قابل اعتراض اور بعید از عقل ہے۔ چونکہ

سورج کو اس مضمون کے متعلق جو میں نے ترلوگی ناتھ کو اس کی بابت تفصیل سے لکھا ہے جاننے کی خواہش تھی میں نے سورج کو صرف اس خوف سے نہیں لکھا کہ وہ میرے خط کو ہر ایک شخص کو نہ دکھا سکے گا میں تمھیں اس خط کے دیکھنے کی صلاح دوں گا۔ مختصر یہ کہ تمھارے مضمون کا لہجہ بہت زیادہ گستاخانہ اور خود پسندانہ ہے جو کیپٹل "I" کے استعمال سے ظاہر ہے۔ ایک شخص بھی جس نے جماعت کا درحقیقت خیال کیا ہے اور اس کے لئے کچھ کام کیا ہے اس بات کا حق نہیں کہ وہ اس زور کے ساتھ لکھے، علاوہ بریں تم طیش میں یہ بھول گئے کہ تم جماعت کی لڑکیوں کے بارے میں لکھ رہے ہو اور تمھارا فرض ہے کہ تم تہذیب اور اخلاق کے معمولی اصول کا بہت غور سے مطالعہ کرو کہ ایسے نازک امر کے بیان کرنے میں ان کی حیا اور سیرت پر اس قدر ذاتی اثر پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے بدترین بات یہ تھی کہ یہ شخصی ہجو سے بھری ہوئی تھی۔ ہر وہ شخص جو اس کو پڑھے گا وہ کہے گا کہ تمھارے دماغ میں کوئی خاص شخص تھا جسے تم نے اپنی سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ چیز بہت زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔

رہا مضمون کا موضوع مجھے ضرور اس کے لئے صرف اتنا کہنا ہے کہ میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ مجھے تسلیم ہے کہ دورِ حاضر کی لڑکی میں بہت زیادہ شوخی ہوتی ہے میں اس شوخی کے خلاف رہا ہوں اور اب بھی اس کا مخالف ہوں۔ اور واقعات کو جو سطحی نقل ہیں میں قابل معافی تصوّر کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مجھے صنفِ نازک کی خوبی میں عموماً اور اپنی لڑکیوں کے کردار میں بہت زیادہ اعتقاد ہے۔ میرا یہ اعتقاد ذاتی نہیں ہے۔ بحیثیت مخلوق کے جو ہر خواہش کا شکار ہو جاتے ہیں چنانچہ میں سخت پردہ کی تجویز کا مشورہ نہ دوں گا تاکہ وہ نیک بنیں۔ نہ میں یہ کہوں گا کہ ہماری عورتوں کا خاص تعلق یہ ہے کہ وہ اپنے امورِ خانہ داری میں مشغول رہیں اور اپنے

شوہروں کو آرام دیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جن خیالات کا اظہار میں نے پھول مالا نظم میں کیا ہے اس بلند ترین مقصد کے واسطے عورتیں ہماری جماعت میں پیدا ہوئی ہیں اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہمارا سلوک عورتوں کے ساتھ ہمدردی سے ہونا چاہیئے اور گستاخی و نفرت سے نہیں ورنہ ہمارے کام کی بھی اصلاح مشکل ہو جائے گی اور لوگ تم سے مشتعل ہو جائیں گے۔

مجھے جو کہنا تھا یہ ہے لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ کسی طرح تم پر ناجائز دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے ذوق اور طرز نگارش کی احتیاط میں کافی تعلیم یافتہ ہو لیکن باوجود اس کے میرا خیال ہے کہ میں تمھیں اس قابل اعتراض طریقہ کار سے متنبہ کردوں جو تم نے اختیار کیا ہے۔ بہت ممکن ہے تمھیں ایسے لوگ مل جائیں جو ایسے مضمون لکھنے پر تمھاری تعریف کریں لیکن اصلیت یہ ہے کہ تمھارا غیر ضروری طیش کے اظہار سے ان لوگوں کی نظر میں تمھاری وقعت نہ ہوگی۔ تم میرے ساتھ ہمیشہ ہر ممکن عزت اور محبت سے پیش آئے ہو اور کبھی میرے مشورہ پر ناراض نہیں ہوئے ہو۔ تم کو اب بھی میری طرف سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر میری کسی بات سے تمھارے مضمون پر تنقید ہو یا تمھارے جذبات کو ٹھیس لگے تو میں اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں۔"

تمھارا خیر اندیش

برج نرائن چکبست

چکبست کے اس خط سے ان کے خیالات بالکل صاف اور واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف تو کسی حالت میں بھی اپنی قوم کی لڑکیوں پر تنقید نہیں برداشت کر سکتے تھے، دوسری طرف ان کا اصلاحی جذبہ ان کو ہر ترقی کی طرف قدم اٹھانے پر آمادہ کرتا تھا۔ ان کی تمام زندگی قوم اور ملک میں اصلاحی جذبہ کو پوری طرح سے بیدار کر کے اصلاح کو عام کرنے میں گذری۔ انھوں نے اپنی زیادہ تر نظمیں ان ہی

واقعات اور جذبات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں جن کی بحث گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔

گذشتہ اوراق سے یہ پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے کہ چکبست کا اصلاحی نظریہ کیا تھا اور جس کام کو انھوں نے سولہ سال کی عمر سے شروع کیا وہ آخر میں کہاں تک کامیاب رہا۔ ۱۸۹۸ء سے ان کی اصلاحی نظمیں ملتی ہیں۔ چند دنوں بعد کلب کی شکل میں یہ تحریک اور نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ۱۹۱۸ء تک یہ اصلاحیں صرف کشمیری پنڈتوں کے واسطے تھیں۔ پھر بھی انھوں نے ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی سیاسی حالات اور سیاسی رہنماؤں کے اثرات نے ان کے دماغ کو متاثر کر دیا اور جب ۱۹۱۸ء میں صبح امید شائع کرنا شروع کیا تو وہ ایک کشمیری پنڈت سے زیادہ ایک ہندوستانی کی شکل میں سامنے آئے۔ ساتھ ہی ان کی تحریک اب ایک ہندوستانی اصلاحی تحریک ہو گئی تھی۔

———— ※ ————

سیاسی اور قومی تصورات

اپنی پانچ ہزار سال کی تاریخ میں ہندوستان کی قومیت اور وطن پرستی نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی اصل نمود ہندوستان میں انگریزوں کے عمل دخل کے بعد سے ہوئی۔ اس کی سب سے نمایاں وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مختلف قوموں کے جو لوگ وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آئے اور کچھ دنوں تک ایک دوسرے کے حریف رہنے کے بعد گھل مل کر ایک ہو گئے۔ انھوں نے اسی ملک کو اپنا وطن بنا لیا اور یہاں کی عام زندگی میں شریک کار کی طرح بسر کرنے لگے، لیکن مغرب سے آئے ہوئے انگریز ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہندوستانی بنتے، وہ یہاں کی دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنے ملک لے جانے لگے۔ اور یہاں کے خون سے وہاں کے چہروں پر رونق آنے لگی۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ہندوستانی اسے محسوس کرتے اور قومی احساس سے مخمور ہو کر اپنی آزادی کی جدوجہد کرتے۔ ہندوستان انگریزوں کا وطنی علاقہ نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ یہاں کے بسنے والوں کی وطن پرستی سے بھی خوف زدہ تھے کیونکہ یہی وطن پرستی کا جذبہ بنیاد بن کر قومی جدوجہد میں تبدیل ہو رہا تھا۔

وطن کی محبت اور وطن پرستی انسان کے اہم ترین جذبات میں شمار کی جاتی ہے۔ اگر تاریخ کے شروع کے اوراق کی گردان کی جائے تو یہ جذبہ کسی نہ کسی طرح ہر قوم میں ضرور نمایاں ہو جاتا ہے۔ آج بھی یہ انسانوں میں عام ہے۔ جو مختلف شکلوں میں برابر نمایاں ہوتا ہے۔ کبھی لوک گیت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو کبھی قصہ کہانیوں کی رُوح بن کر سامنے آتا ہے۔ موجودہ دَور میں اس کی عام شکل سیاسی اور قومی ہے۔

انگریز جب ہندوستان میں آئے تو اس وقت سے ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہاں کے ہندو اور مسلم دونوں بھائی بھائی کی حیثیت سے رہتے ہیں ایک دوسرے کے سچے ہمدرد اور مددگار ہیں۔ انھوں نے برابر اس کی کوشش کی کہ ہندو مسلمان دونوں میں اس بھائی چارہ کو ختم کرائیں۔ یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔

"۱۸۲۱ء میں جب فوجوں کو پھر سے منظم کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ برطانیہ کے ایک افسر نے کہا کہ انتظامی معاملات میں ہندو مسلم الگ الگ کئے جائیں[۱]۔"

غدر کے بعد سر جون لارنس کے سامنے بیان دیتے ہوئے جون کوک نے کہا:۔

"ہمارا نقطہ نظر یہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں میں جو فرق ہے اس کو زیادہ کیا جائے اور ان کو ملنے سے دور رکھا جائے[۲]۔"

لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی ۱۴ر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں:۔

"(Divide and Rule) لڑاؤ اور حکومت کرو"، رومن سلطنت کا پرانا طریقہ تھا اور یہی ہمارا نظریہ ہونا چاہیئے[۳]۔"

آر۔ پی۔ دت نے اپنی کتاب "انڈیا ٹوڈے" میں تحریر کیا ہے[۴]:۔

"ہندو مسلم فرق کو پیدا کرنے کی تمام تر ذمہ داری انگریزوں پر ہے۔ انھوں نے اس کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا اور ساتھ ہی اس کا بیجد پروپیگنڈا کر کے اس کو اور پھیلایا۔ ڈاکٹر امبیدکر نے ۱۹۳۰ء کی

---

[۱] اے۔ ہسٹری۔ آف ہندو مسلم پرابلم ان انڈیا رپورٹ مارچ ۱۹۳۱ء از ڈاکٹر بھگوان داس صفحہ ۱۱۹

[۲] اے۔ ہسٹری۔ آف ہندو مسلم پرابلم ان انڈیا۔ رپورٹ مارچ ۱۹۳۱ء۔ از۔ ڈاکٹر بھگوان داس صفحہ ۱۱۹

[۳] اے۔ ہسٹری۔ آف ہندو مسلم پرابلم ان انڈیا۔ رپورٹ مارچ ۱۹۳۱ء۔ از ڈاکٹر بھگوان داس صفحہ ۱۲۰

[۴] انڈیا ٹوڈے۔ از۔ آر۔ پی۔ دت۔ شائع کردہ بمبئی پیپل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۴۷ء

رپورٹ میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔"

ان تمام کوششوں کے باوجود ۱۸۵۷ء تک ہندو مسلم میں کوئی فرق انگریز پیدا نہ کر سکے لیکن اس کے بعد انھوں نے ایک اور ترکیب کی۔ انگریز مسلمانوں کو اپنا خاص دشمن کہنے لگے اور اس کے ساتھ ہی ان کو ہر طرح سے تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو گئے۔ دوسری طرف ہندوؤں کو اپنا مددگار ظاہر کیا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے اپنی فسادات کانپور کی تحقیقاتی رپورٹ میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:[۱]

"ان تمام چیزوں کے باوجود ۱۸۵۷ء تک آپس میں کوئی خاص فرق پیدا نہ ہو سکا تھا لیکن اس وقت کے بعد سے انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنا خاص دشمن تصور کر کے ان کو ہر طرح سے دبانا شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں کو ابھارنے کی کوشش ہونے لگی تھی۔ مسلمانوں کو فوج سے الگ کر دیا گیا تھا اور قانون کی کوئی بھی جگہ ان کو نہ دی گئی۔"

ایک طرف تو یہ حالت تھی دوسری طرف انگریز اپنے ملک میں ہندوستان کی صحیح حالت کا علم نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اگر ہندوستان کا صحیح حال انگلستان کے رہنے والوں کو معلوم ہوا تو ممکن ہے ان کو کچھ ہمدردی ہندوستانیوں سے پیدا ہو۔ سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب میں ہندوستان کی تصویر جن الفاظ میں پیش کی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے تحریر کرتے ہیں:[۲]

"ہندوستان کے متعلق سب سے پہلے یہ سمجھ لینا بے حد ضروری ہے کہ اس کی وہ حالت نہیں جو مغربی ممالک کے خیال میں ہے۔ وہاں کسی قسم کا اتحاد۔ جغرافیائی۔ سیاسی، سوشل یا مذہبی وجود نہیں نہ تو ہندوستانی ایک قوم ہیں، جن کے متعلق ہم لوگ اس قدر سنتے ہیں۔"

آخر رفتہ رفتہ آپس میں فرق بڑھتا گیا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی ۱۸۸۴ء کو جو تقریر سر سید احمد خاں مرحوم نے گرداس پور میں فرمائی اس سے حالات پر کچھ

---

[۱] ہسٹری آف ہندو مسلم پرابلم ان انڈیا۔ رپورٹ مارچ ۱۹۳۱ء از ڈاکٹر بھگوان داس

[۲] انڈیا اٹس ایڈمنسٹریشن اینڈ پروگرس۔ از سر جون اسٹریچی ۱۸۸۸ء صفحہ ۵

پر کچھ روشنی پڑتی ہے کہ ہر ہندوستانی اس وقت تک اتحاد کو قائم رکھنے کی کس حد تک کوشش کر رہا ہے۔ سر سید احمد خاں کہتے ہیں[۱]:۔

"پرانے وقت سے آج تک قومیت کا لفظ ایک ملک کے رہنے والوں کے لئے استعمال ہوتا آیا ہے گو کہ وہ لوگ آپس میں بعض چیزوں میں مختلف الخیال ہوتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان بھائیو! کیا تم ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کے ہو کیا تمھاری پیدائش یہاں نہیں ہوئی اور تم میں سے یہاں لوگ نہیں مرے۔ کیا تم اس زمین کو محبت سے نہیں دیکھتے اور یہاں محبت سے نہیں رہتے۔ یاد رکھو لفظ ہندو اور مسلم صرف مذہبی فرق کے لئے ہیں اس کے علاوہ جو اس ملک میں رہتے ہیں خواہ ہندو ہو یا مسلمان ہو یا عیسائی ہو ایک قوم ہیں ان سب کو مل کر ملک اور قوم کی بھلائی اور ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے"

جب انگریزوں نے یہ حالت دیکھی کہ وہ آستین کا سانپ سمجھے جانے لگے تو مسٹر بیک ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ آئے انھوں نے رفتہ رفتہ سر سید احمد خاں پر اپنا اس قدر اثر جما لیا کہ سر سید احمد خاں نے اپنے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو ان کے سپرد کر دیا۔ یہ زبردست چیز اب ان کے ہاتھ آگئی تھی۔ کیونکہ وہ جو کچھ نکلتے تھے وہ سر سید احمد خاں مرحوم کے نام لکھا جاتا۔ اور گویا یہاں سے اعلانیہ ہندو مسلم اختلاف کی بنیاد پڑ گئی۔ اس کے متعلق سید طفیل احمد اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں[۲]۔

"مسٹر بیک کے کہنے پر سر سید احمد خاں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ ان کے سپرد کر دیا۔ مسٹر بیک نے بنگالیوں اور ان کی تحریک کے خلاف زبردست ایڈیٹوریل کالم میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ جو سر سید احمد خاں سے منسوب ہوئے اور بنگالیوں نے سر سید احمد خاں کو برا کہنا شروع کیا اس طرح سے

---

[۱] اے ہسٹری آف ہندو مسلم پرابلم ان انڈیا۔ رپورٹ مارچ ۱۹۳۱ء از ڈاکٹر بھگوان داس

[۲] ہندوستان میں مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ از سید طفیل احمد صاحب صفحہ ۲۸۰

بنگال سے اعلانیہ لڑائی شروع ہوئی"۔

آخر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ شروع سال میں ہندو اور مسلمان بعض انگریزوں کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی کی کوششوں میں لگے رہے لیکن مسٹر بیک کا جادو سرسید احمد پر چلتا ہی رہا جیسا کہ سید طفیل احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں[۱]:۔

"انھیں (بیک) کی کوشش سے سرسید احمد کانگریس کے بھی مخالف ہوئے اور آخر ۱۸۸۶ء میں انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی"۔

دراصل ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۶ء کے درمیان جیسے جیسے مغربی سیاست میں تبدیلی ہوتی گئی اس کا اثر ہندوستان پر برابر ہوتا رہا۔ کیونکہ اسی ہنگامی زمانہ میں لارڈ رپن وائسرائے ہوکر ہندوستان آئے یہ نہایت شریف انسان تھے اور وہ برک کے اصول کے پیرو تھے کہ "جو چیز اخلاقی حیثیت سے ٹھیک نہیں وہ سیاسی حیثیت سے بھی درست نہیں ہوسکتی" انھوں نے اپنے چار سال کے قیام میں لوکل گورنمنٹ کا سنگ بنیاد رکھا۔ لیکن ان حضرات کو بھی جو زحمتیں برداشت کرنی پڑیں اس کا سر جان لارنس کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے یہ خط مسٹر ای۔ پیرے کے نام تحریر کیا ہے جس میں فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کی حکومت کے معاملہ میں ایمانداری سے کام کرنے میں ناقابل بیان زحمتیں پیش آتی ہیں۔ اگر کوئی بات کی جاتی ہے یا اس کی کوشش بھی کی جاتی ہے جس سے عوام کو فائدہ پہونچے تو انگلینڈ میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے جو عوام سے مدد چاہنے لگتا ہے بعض اوقات یہ ہنگامے اس طرح کے ہوتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ہر شخص انصاف۔ انسانیت اور بہتر طریقوں کو چاہتا ہے لیکن جب ان اصولوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور کسی کا بھی کوئی نفع متاثر ہونے لگتا ہے تب ان کے اصول پھر بدلنے لگتے ہیں"۔

اس بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز اپنے فائدے کے سامنے اصولوں کی

---

[۱] ہندوستان میں مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ از سید طفیل احمد صاحب۔ صفحہ ۲۸۰

بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی شریف اور انسان دوست وائسرائے ہندوستان آیا اور اس وقت انگلستان کی حکومت بھی کسی انسان دوست پارٹی کے ہاتھ میں ہوئی تو کچھ فائدہ ہوجاتا لیکن لارڈ رپن کے بعد لارڈ ڈ لٹن وائسرائے ہوکر ہندوستان آئے۔ یہ ہندوستان کے زبردست دشمن تھے۔ سی۔ وائی چنتامنی اس کے واسطے تحریر فرماتے ہیں[1]۔

"لیکن رپن کے بعد لارڈ ڈ لٹن وائسرائے ہوکر آئے۔ انھوں نے آتے ہی تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ بہت ہی بُرا آدمی تھا۔ لیکن ان سختیوں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کے زمانہ میں ہندوستانیوں کی کچھ آنکھیں کھلیں اور اس کے جانے کے سال بھر کے اندر ہی انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔"

کانگریس کے شروع کے اجلاس میں سرکاری ملازم بھی شریک ہوئے تھے بلکہ وائسرائے صاحب نے بھی اس سے لگاؤ ظاہر کیا تھا لیکن ۱۸۹۰ء میں جب کانگریس کے سالانہ جلسے کا دعوت نامہ وائسرائے کو بھیجا گیا تو وہاں سے وہ یہ کہہ کر واپس کردیا گیا "کہ یہ دعوت نامہ اس وجہ سے واپس کیا جارہا ہے کہ سرکاری آدمی کسی سیاسی جلسہ میں شرکت نہیں کرسکتے"۔ اس کے بعد سے باقاعدہ کانگریس کی مخالفت شروع ہوئی۔ کانگریس نے شروع سے یہ مانگ رکھی تھی کہ سرکار ایک کمیشن کے ذریعہ انتظامی معاملات کی جانچ کرے اور ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانیوں کو نمایندگی دی جائے۔ ۱۸۹۲ء میں سرکار نے کونسل کو لیجسلیچر (مجلس قانونساز) میں بدل دیا۔ ۱۹۰۴ء میں کانگریس کے صدر اور مجلس عاملہ نے صوبوں میں لوکل سلف گورنمنٹ کی مانگ پیش کی۔ ۱۹۰۵ء میں جب گوکھلے کانگریس کے صدر ہوئے تو انھوں نے ایک ایسی حکومت کو قائم کرانے کی کوشش کی جو انگریزی سرکار کی ماتحتی میں قائم ہو۔ جس طور پر دوسرے نوآبادیاتی ملکوں میں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب ہم لوگ

---

[1] انڈین پولیٹکس۔ سنس میوٹنی۔ از۔ سی۔ وائی چنتامنی ۱۹۳۶ء

اپنے انتظامی معاملات اچھی طرح سے سنبھال لیں تب اس سے کچھ زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب چکبست سن شعور کو پہونچے تھے۔ بشن نرائن در کے اثرات کے ساتھ ساتھ گوکھلے کی تقریروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ بھی سیاست سے دلچسپی لینے لگے۔ گو کہ وہ کبھی بھی عملی سیاست میں داخل نہ ہوئے پھر بھی ان کا کلام ان کی تمناؤں کا آئینہ ہے۔ وہ جذبۂ حب وطنی سے سرشار معلوم ہوتے ہیں، اور یہی ان کے سیاسی اور قومی تصورات کی بنیاد ہے۔

چکبست کی نظم "خاک ہند" اسی زمانہ (۱۹۰۵ء) کی لکھی ہوئی ہے شروع میں ہندوستان کی عظمت اور شان کا ذکر کرنے کے بعد جو اشعار ہیں اس زمانہ کی سیاست اور چکبست کے خیالات کا آئینہ ہیں۔ فرماتے ہیں :؎

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں ۔۔۔ کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں ۔۔۔ پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

اس بند سے صاف نمایاں ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں ہر چیز پرانے زمانہ کی طرح موجود ہے صرف حب وطن کے جذبہ کی کمی ہے جس نے ملک کو غلام بنا کر رکھ دیا۔ آگے فرماتے ہیں ؎

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا ۔۔۔ دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا ۔۔۔ اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اب اپنی حالت کو بیان کرتے ہیں۔ غلامی اور ہندوستانی عوام کی بے پروائی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ یہ غلامی ہے جو امتحان کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کو لاش بے کفن کہہ کر شاعر نے اپنے خیالات کا مکمل طور پر اظہار کیا ہے۔ ہندوستانی عوام غلام بن گئے ساتھ ہی انھوں نے اپنے ہاتھ پیر ڈال دیے

اور بجائے محنت اور جوش کے ساتھ اس غلامی کو ختم کرنے کی کوشش کے ان میں اس طرح کے احساس کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ شاعر اس لاپروائی کو اس بند میں بیان کرنے کے بعد "صورِ حبِ قومی" سے ہندوستانیوں کو جگانا چاہتا ہے

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

اس بند سے شاعر کی آرزو کا پتہ چلتا ہے اور اس کے بعد کے دو بندوں میں شاعر کی آرزو اپنے درجہ کمال کو پہونچتی دکھائی دیتی ہے

شیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک رنگین طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک ہم بیکسوں کو اپنا پیارا چمن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

یہ تھی ہندوستان کی سیاسی حالت جس نے چکبست کے حساس دل میں جذبۂ حبِ وطن کو اُبھارا اور اس جگہ پر لا کھڑا کر دیا کہ وہ اس جذبہ سے سرشار نظر آتے ہیں۔ یا بقول پروفیسر احتشام حسین صاحب "پیامبر دورِ جدید" بن کر سامنے آئے۔

چکبست کے اس جذبہ نے ان کو محض ایک شاعر نہ رکھا بلکہ ان کو ایک سیاسی مفکر کی حیثیت بھی دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے عملی سیاسی زندگی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن ان کا سارا کلام اس جذبہ سے متاثر ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ تلک کا گروہ مکمل آزادی چاہتا تھا اور گوکھلے کا گروہ انگریزوں کے زیر سایہ حکومت کا انتظام یا سوراج کا خواہاں تھا۔ چکبست

گو کھلے اسکول سے متاثر ہو کر اس کے پیرو بن گئے۔

چکبست کا جذبۂ حبِ وطن ہم کو کبھی ہندو مسلم اتحاد کی شکل میں ملتا ہے جن کے اتحاد کے بغیر جنگِ آزادی کامیاب نہ ہو سکتی تھی، کبھی اپنے اوپر کی پابندیوں کو ختم کرانے کی شکل میں ملتا ہے۔ مثلاً آزادی اخبار۔ آزادی گفتار اور اخیر میں ہوم رول ان کا مقصد ہو جاتا ہے۔

چکبست... مذہب کے فرق کو سیاسی میدان میں انتہائی درجہ نقصان دہ چیز تصور کرتے تھے۔ ان کا تصور بھی اور لوگوں کی طرح یہ تھا کہ جب تک دونوں ایک ہو کر جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس وقت تک ایک طرف تو یہ جنگِ آزادی پوری طور پر ہو نہیں سکتی اور دوسری طرف مخالفین یعنی انگریزوں کے اعتراض کا جواب نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں قومیت اور اتحاد نہیں۔ نظم "آوازۂ قوم" میں انگریزوں کے ان خیالات کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

رقیب کہتے ہیں رنگِ وطن نہیں یکساں — بنا ہے قوس قزح خاکِ ہند کا داماں
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں — نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں

جو ہوم رول پہ یہ چشمِ شوق شیدا ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

دراصل ہندوستان کے ہر رہنے والے کو ہندوستانی ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ہندو یا مسلم، تاکہ قومیت کی ایک بنیاد ہو۔ وہ مذہبوں کے فرق کو بُرا تصور کرتے تھے اور اس کے بجائے جذبۂ محبت پیدا کرنا چاہتے تھے "مذہبِ شاعرانہ" میں ان خیالات کا صاف پتا چلتا ہے ؎

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا — جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا
جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی — کعبہ ہے وہی اور وہی بتخانہ ہے میرا
میں دوست بھی اپنا ہوں عدو بھی ہیں اپنا — اپنا ہے کوئی اور نہ بیگانہ ہے میرا
خاموشی میں یاں رہتا ہے تقریر کا عالم — میرے لبِ خاموش پہ افسانہ ہے میرا
کہتے ہیں خودی کس کو خدا نام ہے کس کا — دنیا میں فقط جلوۂ جانانہ ہے میرا

مختلف فرقوں کے درمیان جو خلیج انگریز پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے تھے
چکبست اس کے شدید مخالف تھے اور ہر حالت میں اس کو ختم کرنا چاہتے تھے۔
چکبست کے یہاں حب الوطنی سب سے اہم جذبہ تھا، لیکن اس جذبہ کو بروئے کار
لانے کے لئے وہ انقلابی نہیں بننا چاہتے تھے، بلکہ اصلاحی طریقہ استعمال کرنے
کے قائل تھے۔ اسی وجہ سے وہ گوکھلے اور ان کے گروہ کے پیرو تھے، اور تلک
پر سخت تنقید کرتے تھے، باوجود اس کے کہ وہ تلک کے جذبۂ حب وطن سے متاثر
تھے۔ اور اس کی قدر بھی کرتے تھے جس کا پتا تلک کے نوحہ سے چلتا ہے؎

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار | روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار | طنطنۂ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بے کسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اُٹھ گیا دولتِ ناموسِ وطن کا وارث | قوم مرحوم کے اعزازِ کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شیر دکھن کا وارث | پیشواؤں کے گریجتے ہوئے رَن کا وارث

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دَور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

یہ خیالات تلک کے انتقال کے بعد کے ہیں۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں جب تلک اعتدال پسند
طبقہ کے مخالف تھے اس وقت چکبست ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں[1]:۔

"مسٹر تلک کے جو احسانات قوم اور ملک پر ہیں انھیں ہم فراموش
نہیں کرسکتے ہیں مگر مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی تمام زندگی کا طرزِ عمل
ایسا رہا ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سوشل اصلاح کے معاملہ میں
آپ نے ہمیشہ آزاد خیالی اور جمہوریت کے اصولوں پر خاک ڈالنے کی کوشش
کی ہے اور اپنے کم نصیب ہم جنسوں کی سوشل غلامی قائم رکھنے میں آپ
کو ذرا دریغ نہیں ہے۔ مسٹر رینا ڈے مرحوم نے ملک اور قوم کی سوشل

---

[1] رسالہ صبح امید اڈیٹر برج نرائن چکبست۔ مارچ ۱۹۲۰ء صفحہ ۴
پبلشر پنڈت کشن پرشاد کول۔

اصلاح کے لئے یادگار کوششیں کیں، لیکن مسٹر تلک ہمیشہ ان کے مخالف
رہے۔ حتیٰ کہ پونا میں جب کانگریس کا اجلاس ہوا تو مسٹر تلک نے یہ بھی
گوارا نہ کیا کہ کانگریس کے پنڈال میں آل انڈیا سوشل کانفرنس کا
اجلاس ہوسکے۔ چنانچہ مسٹر رینا ڈے کو سوشل کانفرنس کے لئے
دوسری جگہ تلاش کرنا پڑی۔ سوشل اور مذہبی اصلاح کی مخالفت
کی بدولت مسٹر تلک کا اثر مہاراشٹر کے عوام الناس پر قائم ہوگیا ہے
جو انھیں قدامت پرستی کا اوتار سمجھتے ہیں۔ مگر زمانہ کی ترقی کے ساتھ
عوام الناس کی بھی آنکھیں کھلی جاتی ہیں، اور قدامت پرستی کا ڈھکوسلا
عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس خاص موقع پر جب کہ لڑکیوں کی
تعلیم کا مسئلہ درپیش تھا مسٹر تلک نے محسوس کیا ہوگا کہ زمانہ کروٹ
لے رہا ہے اور اب یہ ممکن نہیں ہے کہ جس زبان سے پولیٹکل آزادی کے
نعرے بلند کئے جائیں اسی زبان سے سوشل غلامی کے لئے منطقی اور
تاریخی دلیلوں کے حیلے تلاش کئے جائیں۔"

چکبست کے یہاں تلک کی قدر صرف اس حد تک ہے جہاں تک ان کا
جذبۂ حبِ وطنی سے تعلق ہے۔ لیکن اگر وہ کوئی ایسا تصور پیش کرنا چاہتے
ہیں جس سے ان کے خیال سے وطن کی آزادی پر اچھا اثر نہیں پڑتا تو چکبست
تلک کے شدید مخالف بن جاتے ہیں۔

۱۹۱۶ء ہندوستان کی سیاسی زندگی کا ایک اہم سال ہے۔ اسی
سال مسز اینی بسنٹ نے "ہوم رول" کی تحریک ہندوستان میں شروع کی۔ یہ
کوئی نئی تحریک نہیں تھی، بلکہ جس طرح سے آئرلینڈ کو برطانیہ حکومت کی
ماتحتی میں اپنے اندرونی معاملات میں آزادی مل گئی تھی اسی طریقہ وہ
ہندوستان کی آزادی چاہتی تھیں۔ چکبست اس تحریک سے بے حد
متاثر تھے، جس کا مکمل علم ان کی نظم "مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا
پیغامِ وفا" سے ہوتا ہے۔ مسز بسنٹ نے جب یہ تحریک شروع کی تو اس وقت
ان کا سن کافی ہوچکا تھا۔ چکبست لکھتے ہیں ؎

قوم غافل نہیں مانا تیری غمخواری سے　　زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
آگ بھڑکی ہے تیری آہ کی چنگاری سے　　خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے

دل ترا قوم کے دامن میں دئیے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تیری زنداں میں لئے جاتے ہیں

لہلہاتا ہے محبّت کا تیری دل میں چمن　　ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر ہمیں تیرا دامن
تیری تصویر سے ہیں قوم کی آنکھیں روشن　　تیرے بالوں کی سپیدی ہے کہ ہے صبح وطن

دلِ پُر درد کی تصویر ہے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ہے پہنے ہوئے مورت تیری

مسز بسنٹ سے چکبست کی عقیدت کبھی "ماتا" کبھی "ماں" کے الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے سپید بالوں میں صبح وطن نظر آتی ہے۔ یہ جذبہ صرف اس لئے ہے کہ مسز بسنٹ کو ہندوستان سے محبّت تھی، اور انھوں نے ہوم رول تحریک پیش کی تھی۔ آگے بڑھ کر پھر اس نظم میں فرماتے ہیں ؎

داستاں دین کی دنیا کو سنائی تو نے　　مذہبی بیر کی بنیاد مٹائی تو نے
آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بجھائی تو نے　　راہ انصاف کی اندھوں کو دکھائی تو نے

کس نے گرتی ہوئی قوموں کو سنبھالا ہوتا
تو نہ ہوتی تو نہ دنیا میں اُجالا ہوتا

مسز بسنٹ تھیاسوفسٹ ہونے کی حیثیت سے مذہب کی پابندیوں کی سخت مخالف تھیں۔ وہ مذہب کو محبّت کا ذریعہ خیال کرتی تھیں اور مذہب کے اختلاف کو ختم کرنا ان کا اہم ترین مقصد تھا۔ چکبست خود مذہبی بیر کے سخت مخالف تھے۔ مسز بسنٹ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہند بیدار ہوا یوں تری بیداری سے　　جیسے برسوں کا مریض اٹھتا ہے بیماری سے
قوم آزاد ہوئی تیری گرفتاری سے　　چاندنی پھیل گئی حسن وفاداری سے

تو نظر بند ہے جلوہ ہے ترا ہر گھر میں
شمع فانوس میں ہے نور ہے محفل بھر میں

پھول پتّے ہیں ترے رنگ و فلک سے آباد — درد مندوں کی طرح کرتے ہیں بیچھر فریاد
بیوفاؤں کی ہوئی جاتی کوشش برباد — تو گرفتار سہی ہے تری شکتی آزاد

راحت جسم کا در بند رہے یا نہ رہے
ڈھیر مٹی کا نظر بند رہے یا نہ رہے

مسز بسنٹ کی آرزو و خواہش۔ آواز تو نظر بند نہ ہو سکی بلکہ صرف جسمانی طور پر ان کا جسم خاکی نظر بند ہو گیا تھا۔ جس کو مٹی کا ڈھیر کہتے ہوئے چکبست یہ ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ نظر بندی اس حوصلہ کو پست نہ کر سکے گی۔ اس جذبہ کو کچل نہ سکے گی۔ اس آرزو کو برباد نہ کر سکے گی جو مسز بسنٹ سے ہندوستان کو عطا ہوا ہے۔ یہاں ایک فلسفی کی حیثیت سے انسانی جسم کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور مسز بسنٹ نے جو جذبہ عطا فرمایا تھا اس کو اور واضح کرتے ہیں ؎

تو نے پودا جو اُگایا تھا وہ پھل لایا ہے — آبرو قوم نے پائی ہے وہ دن آیا ہے
ہم نے بھولے ہوئے ورثہ کا نشاں پایا ہے — مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

اپنے رسالہ صبح اُمید میں اکثر وہ مسز بسنٹ کی خدمات کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ مارچ ۱۹۲۰ء کے رسالہ میں فرماتے ہیں[۱]:۔

"ہم کو مسز بسنٹ کے اکثر اصولوں سے اختلاف کرنے کا موقع رہا ہے لیکن آپ کی خدمات ایسی ہیں جن کا اعتراف کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس پیرانہ سالی کے عالم میں جس گرمی کے ساتھ نئے قانون اصلاح کے اصولی اور عملی پہلو سمجھانے کے لئے آپ اپنے آرام و آسائش کو ہندوستان

---

[۱] رسالہ صبح امید۔ مارچ ۱۹۲۰ء۔ صفحہ ۵ اڈیٹر برج نرائن چکبست۔

پر قربان کر رہی ہیں۔ اس سے ہمارے ہم وطنوں کو سبق لینا چاہیے۔ اور یہ سیکھنا چاہیے کہ پولیٹیکل اصولوں کی اشاعت کا دستورالعمل کیا ہے ..... چنانچہ اب مسٹر کھا بڑے بھی لیڈر ہیں۔ اور قوم کی رہنمائی کے فرض ادا کر رہے ہیں۔ حال میں اپنے عزیزان وطن کی رہنمائی کے لئے مسز بسنٹ کو پوتنا اگھشی قرار دیا ہے۔ جس کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ مسز بسنٹ ہمدردی اور محبت کا بہروپ بھر کر عزیزان وطن کو زہر کا گھونٹ پلانا چاہتی ہیں۔ تاکہ ان کی پالٹیکل زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ ہمارے خیال میں اس سے زیادہ محسن کشی اور نفرت آمیز دریدہ ذہنی کی مثال دُنیا کے پردے پر نہ ملے گی۔ اس بزدلانہ حملہ سے مسز بسنٹ کی وقعت ہمارے ہم وطنوں کی نگاہوں میں کم نہیں ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر کنس اور راون کے اخلاقی وارث موجود ہیں۔ جو سچائی اور نیک نیتی کے اوتار پر حملہ کرنے میں دریغ نہیں کرتے"

۱۹۱۹ء میں مسز بسنٹ نے اپنا ہفتہ وار اخبار "یونائیٹڈ انڈیا" نکالا اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے چکبست نے ان کی خدمات اور اس اخبار سے اپنی توقعات کا اظہار کیا ہے [۱]

"مسز بسنٹ کے غیر مستقل انداز طبیعت کی وجہ سے اکثر خیالات اور عقائد کا فوری اُلٹ پھیر نظر آتا ہے۔ اس کے متعلق اعتراضات کی گنجائش کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس معجزہ نما مستعدی کے ساتھ اس پیرانہ سالی کے عالم میں آپ ہندوستان کی خدمت کر رہی ہیں۔ اس کی یاد ہمارے اہل وطن آسانی کے ساتھ فراموش نہیں کر سکتے۔ حال میں ولایت سے آپ نے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا ہے جس کا نام یونائیٹڈ انڈیا ہے۔ ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] رسالہ صبح اُمید۔ نومبر ۱۹۱۹ء۔ صفحہ ۷۔ اڈیٹر برج نرائن چکبست

کہ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے مختلف پولیٹکل گروہوں کے خیالات کا
اظہار ہوتا رہے گا۔ ہندوستان کی آزادی کی مدد میں شریک رہنا اس کا
مسلک ہے۔ پہلے نمبر میں سر سنکرن نائر مسٹر چینتامنی۔ مسٹر پولک۔ مسٹر
شاستری۔ مسٹر دادیا اور مسٹر رام چند راؤ کے مختصر دلچسپ مضامین شائع
ہوئے ہیں۔ آئندہ پرچوں میں ڈاکٹر سپرو۔ مسٹر کیلکر۔ مسٹر سی۔ پی۔ راماسوامی
ائر۔ مسٹر بنرجی کے مضامین شائع ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اخبار انڈیا
کی موجودہ روش سے ہمارے ہم وطنوں کے پولیٹکل حقوق کو جو صدمہ
پہونچنے کا اندیشہ تھا وہ یونائیٹڈ انڈیا کی موجودگی میں کم ہو جائے گا۔"

سنہ ۱۹۱۹ء کے شروع میں مسز بسنٹ اور کانگریس میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے اور اس کی حد یہاں تک پہونچ گئی کہ ان کے ساتھی مسٹر سی۔ پی۔ راماسوامی ائر اور انھوں نے کانگریس کے سکریٹری کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی جو ڈپوٹیشن ولایت جانے والا تھا اس کی شرکت سے بھی انکار کر دیا۔ دراصل کانگریس کے اندر اس وقت تلک کا زور تھا جو انتہائی درجہ تعجیل پسند تھے۔ مسز بسنٹ اس زمانہ میں اس قدر تیز رفتاری نہیں پسند کرتی تھیں کیونکہ ان کا مسلک یہ تھا کہ مصالحت کے ذریعہ سے اپنے حقوق منوائے جائیں۔ نیو انڈیا مورخہ ۹ر جنوری سنہ ۱۹۱۹ء میں مسز بسنٹ نے اپنے اور کانگریس کے مسلک میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ان کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ چکبست مرحوم نے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے[1]۔

"کانگریس کا موجودہ مسلک	مسز بسنٹ کا آئندہ مسلک
(۱) پرنس آف ویلس کے خیر مقدم سے انکار کرنے کے پردے میں انگلستان کے شاہی خاندان سے بے اعتنائی کا اظہار کرنا جو کہ کانگریس کی قدیم روش کے خلاف ہے۔	(۱) کانگریس کے قدیم روش کے مطابق انگلستان کے خاندان شاہی سے، اظہار محبت کا برتاؤ قائم رکھنا۔

---

[1] رسالہ صبح امید۔ فروری سنہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۱ اڈیٹر برج نرائن چکبست

(۲) صوبجات کے لئے فوری حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کرنا	(۲) بمبئی کی کانگریس کے فیصلہ کا اصلاحات کے اسکیم کی ترمیم کی بابت پابند رہنا اور فوری حکومت خود اختیاری کے مطالبہ کے بدلہ چھ سال کی میعاد کی تائید کرنا۔
(۳) اصلاحات کے اسکیم کی بنیاد پر جو مشورہ قانون انگلستان میں پیش ہو اس کے متعلق مصالحت کی نظر سے بحث ومباحثہ کی گنجائش باقی نہ رکھنا اور ڈیپوٹیشن کو صوبجات کے لئے فوری حکومت خود اختیاری کے مطالبہ کا پابند ہونا۔	(۳) انگلستان کو ایسا ڈیپوٹیشن روانہ کرنا جس کا فرض یہ ہو کہ پارلیمنٹ کے دربار سے ہندوستان کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کرنے کی بحث ومباحثہ کے ذریعہ سے بہ نظر مصالحت کوشش کرے۔
(۴) بمبئی کی کانگریس کے منتخب شدہ حضرات کا انتخاب رد کرکے ڈیپوٹیشن کے ممبروں کو نامزد کرنے کے لئے دوسری کمیٹی مقرر کرنا۔	(۴) لندن میں ہوم رول کانفرنس میں شریک ہونا۔
(۵) لندن میں کانگریس کے اجلاس کو ردی قرار دینا (کذا)	(۵) شاہ معظم اور پارلیمنٹ کی خدمت میں عرضداشت بھیجنا۔
(۶) شاہ معظم کی خدمت میں عرضداشت بھیجنے سے انحراف کرنا۔	(۶) برٹش کانگریس کمیٹی اور اخبار انڈیا کی ہستی قائم رکھنے کے لئے کوشش کرنا
(۷) برٹش کانگریس کمیٹی اور اخبار انڈیا کا ضابطہ طریقہ پر خاتمہ کرنا	(۷) ادنیٰ قوموں کی نیابت کے لئے کوشش کرنا۔

ان اختلافات کے علاوہ صلح کی کانفرنس میں ہندوستان کی نیابت کی غرض سے مسٹر تلک کی نامزدگی بھی مسز بسنٹ خلاف مصلحت اور دوراز

دانشمندی خیال فرماتی ہیں۔"

یہ تھا خلاصہ جو چکبست مرحوم نے پیش کیا۔ اس سلسلہ میں اپنے رسالہ میں جو ایڈیٹوریل انھوں نے اس کے متعلق لکھا وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ فرماتے ہیں[۱]:۔

"دہلی کی کانگریس میں تعجیل پسند فرقہ کی مزید بلند پروازی و تیز رفتاری کی وجہ سے جو قابل افسوس کاوشیں پیدا ہو گئی ہیں انکا تذکرہ دبی زبان سے امرت بازار پتر کا اور ہندو وغیرہ نے کیا ہے۔ لیکن مسز بسنٹ نے اپنی خلقی آزادی کے ساتھ اختلافات کی ناگوار صورت سے نقاب اُلٹ دی ہے اور دنیا کے سامنے واقعات کی صحیح حالت پیش کر دی ہے۔ مسز بسنٹ کا کانگریس کے موجودہ مسلک سے اصولی اور فروعی اختلافات ہیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر آپ نے اور مسٹر سی۔ پی۔ راماسوامی ائر وغیرہ نے کانگریس کے سکریٹری کے عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کانگریس کی جانب سے جو ڈپوٹیشن انگلستان جائے گا اس میں شریک ہونا منظور نہ کیا ہے۔ مسز بسنٹ اسی باہمی پھوٹ کے لئے مسٹر تلک کے گروہ کو ذمہ دار قرار دیتی ہیں، یہ الزام صحیح ہو کہ نہ ہو لیکن آپ کا یہ فرمانا نہایت درست ہے کہ محض 'نمائشی اتحاد' کی صورت قائم رکھنے کی غرض سے آپ مسٹر تلک اور ان کے رفیقوں کی شریک نہیں رہ سکتیں کیونکہ آپ کو ان کی پولیٹکل روش اور طرز عمل سے قطعی اختلاف ہے۔"

باوجود اس کے کہ چکبست مسز بسنٹ سے اس قدر متاثر ہیں اور ان کو ماتا کہتے ہیں لیکن اگر ان کے کسی اقدام کو وہ قوم کی بھلائی کے لئے نامناسب خیال کرتے ہیں تو وہ سخت تنقید کرنے سے بھی درگذر نہیں کرتے۔ ۱۹۱۸ء میں جب مسز بسنٹ نے انجمن خادمانِ ہند پر اعتراض کیا تو چکبست نے بہت ہی سخت قسم کا اڈیٹوریل لکھا ہے جس سے ان کی سنجیدگی اور وسیع النظری کا

---

[۱] رسالہ صبح امید۔ فروری ۱۹۱۹ء صفحہ اڈیٹر برج نرائن چکبست

ثبوت ملتا ہے[1]:

"اس شور و شر کے زمانہ میں ملک میں ایک طبقہ ایسے ناعاقبت اندیش لوگوں کا پیدا ہو گیا ہے جو اپنی ذاتی نمائش کے شوق سے مجبور ہو کر چند فدائیانِ وطن کو صبح و شام بُرا بھلا کہا کرتے ہیں اور ناواقف عزیزانِ وطن کی آنکھ میں خاک جھونک کر اپنی سرخروئی کی تمناؤں کو پورا کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی حضرات نے کچھ عرصہ سے انجمن خادمانِ ہند (سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی) کے خلاف درپردہ اور علانیہ اس الزام کی اشاعت شروع کر دی ہے کہ اس کے ممبر پولیٹکل خدمت سے گریز کرتے ہیں اور سوشل خدمات کے پردہ میں پناہ لیتے ہیں ایسے بے اصول فتنہ پردازوں سے ہمیں شکایت نہیں ؎

اللہ ہے نگہباں آعلیٰ کی آبرو کا

منھ پر پڑا اسی کے جس نے فلک پہ تھوکا

مگر ہم کو یہ دیکھ کر سخت روحانی صدمہ ہوا کہ مسز اینی بسنٹ صاحبہ نے جن کی زبان کا ہر حرف ذمّہ داری کے کانٹے میں تلنا چاہیئے بمبئی کے جلسہ عام میں اس بے بنیاد الزام کو دہرایا اس امر کی شکایت کرتے ہوئے کہ انجمن خادمان ہند نے کانگریس کے جلسہ خاص کی شرکت سے کیوں کنارہ کشی کی۔ آپ نے یہ فرمایا کہ .... انجمن خادمان ہند قابل قدر سوشل خدمات انجام دے رہی ہے مگر یہ پولیٹکل خدمت نہیں ہے۔ انجمن مذکور ہندوستان کی آزادی کی کوشش نہیں کرتی ہے۔ جو عزیزانِ وطن ملک کی پولیٹکل رفتار سے ناآشنا نہیں ہیں انکی نگاہوں میں یہ الفاظ کانٹوں کی طرح کھٹکتے ہیں۔ انجمن کے پریسیڈنٹ مسٹر سری نواس شاستری کی پولیٹکل خدمات سے انحراف کرنا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔ پنڈت ہردے ناتھ کُنزرو کے پولیٹکل رسالے اور

---

[1] رسالہ صبح امید۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۸-۱۷   اڈیٹر برج نرائن چکبست

مضامین ملک کے سامنے ہیں۔ مسٹر وزے سرونٹ آف انڈیا کے سب اڈیٹر ہیں۔ مسٹر کھیلکار ممالک متوسط کی کونسل کے ممبر ہیں۔ پنڈت گشن پرشاد کول ہندوستانی کے ایڈیٹر ہیں جو کہ پولٹیکل اخبار ہے۔ پونا سے انجمن کے زیر عاطفت گیان پرکاش پولیٹکل اخبار نکلتا ہے مسٹر ونکیٹش تواری ابھودے کے اڈیٹر ہیں اس کے دیگر ممبران بھی برابر پولیٹکل خدمات میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مسٹر دیو دیرا اور مسٹر جوشی زیادہ تر سوشل خدمات کی طرف متوجہ ہیں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انجمن کے ممبر پولیٹکل خدمات سے بے خبر ہیں۔

دوسرے صوبوں کی نسبت ہم زیادہ وثوق کے ساتھ نہیں لکھ سکتے ہیں مگر اپنے صوبہ کے متعلق ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہوم رول کے متعلق جو بحث وتحریک کا سلسلہ یہاں جاری ہوا اس کے فروغ دینے میں انجمن خادمانِ ہند نے جو خدمات انجام دیں وہ قابل سرزنش نہیں ہیں۔ ہوم رول لائبریری انجمن خادمان ہند کی طرف سے شائع کی گئی اور تقریباً چالیس پچاس ہزار رسالے اس سلسلے میں فروخت کئے گئے۔ مختلف اضلاع میں انجمن کے ممبروں نے ہوم رول کے متعلق تقریریں کیں۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے دیہات میں جاکر ہوم رول کی آواز بلند کی۔ اس کے علاوہ سلف گورنمنٹ وغیرہ کے متعلق جو رسالے اردو میں انجمن کی طرف سے شائع ہوئے ان کی یاد ابھی دلوں سے فراموش نہیں ہوئی ہے۔ اگر کافی تربیت اور مطالعہ کے بعد اور نیز خاموشی کے ساتھ ملکی خدمات کا انجام دینا اور گوکھلے مرحوم کے نقش اعتدال کو اپنی زندگی کا چراغ سمجھنا پولیٹکل خدمت سے بے خبر ہونا ہے تو انجمن خادمان ہند کے ممبر ضرور گنہگار ہیں ورنہ ظاہراً ان کا کوئی قصور نظر نہیں آتا ہے۔ ان کی حالت پر یہ شعر ضرور صادق آتا ہے ؎

میرے نصیب میں شہرت کا امتیاز نہیں
فدائے قوم ہوں لیکن زباں دراز نہیں "

ان تمام باتوں کے باوجود مسز بسینٹ کی تحریک ہوم رول سے چکبست بیحد متاثر تھے۔ ان کی تین مکمل نظمیں "وطن کا راگ" "آوازۂ قوم" اور "ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" ہوم رول سے متعلق ہیں۔ یہ تحریک ہندوستان میں ۱۹۱۶ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۷ء تک اس کا بے حد زور رہا۔ ہوم رول تحریک کی بنیاد سلطنت برطانیہ کے سایہ میں ہندوستانی آزادی کی خواہش پر تھی جیسا کہ خود چکبست اپنی نظم "ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" میں بیان کرتے ہیں ؎

اس خاکِ دل نشیں پر بادل سا چھا رہا ہے ۔ طوفان بیکسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دورِ حسرت دنیا سے جا رہا ہے ۔ مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے
برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

مسز بسینٹ نے جو ہوم رول تحریک شروع کی تو اس کے متعلق چکبست اپنی نظم "وطن کا راگ" میں تحریر کرتے ہیں ؎

زمین ہند کی رتبہ میں عرش اعلیٰ ہے ۔ یہ ہوم رول کی امید کا اجالا ہے
مسز بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے ۔ فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ایک زمانہ میں اس تحریک سے ہندوستان کی آزادی کی آرزو بندھی ہوئی تھی۔ آوازۂ قوم میں ہوم رول کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

یہ آرزو ہے کہ جبر و دغا سے کام رہے ۔ وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے ۔ نہ کوئی مرغ خوش الحاں اسیر دام رہے
سریر شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

اس بند میں گویا چکبست ہوم رول کی اور وضاحت کرتے ہیں کہ "سریر شاہ" کا اقبال چمن کی بہار بنا اور تاجدارِ چمن (یعنی برطانیہ کا بادشاہ) چمن کے محافظ

ہوں اسی کے ساتھ "وطن کے باغ میں اپنا انتظام" ہو جس کی وجہ سے "مرغ خوش الحان" اسیر دام نہ ہو سکے۔ دراصل یہی ہوم رول کی تحریک کی صحیح تصویر ہے۔

اس وقت ہندوستان میں جو افسر تھے انھوں نے ہندوستانیوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ آزادیِ تقریر و تحریر اور پریس کی آزادی پر مکمل پابندی لگادی گئی تھی۔ یہ پابندیاں ہندوستان کے لئے نئی نہ تھیں کیونکہ ۱۸۲۳ء میں سب سے پہلے انگریزوں نے اخبار پر پابندی لگائی لیکن اس کے سال بھر بعد سر چالس میٹکاف نے اس پابندی کو ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے دیسی اخبار اس زمانہ میں نکلنے شروع ہو گئے۔ آخر ۱۸۷۸ء میں پھر پابندی لگادی گئی جو جلد ہی ختم بھی ہو گئی۔ چکبست نے اس سے متاثر ہو کر کہا ؎

ہے آجکل کی ہوا میں وفا کی بربادی — سنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی — اُڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی
ہوائے شوق میں غنچے مہک نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

جو آجکل ہے محبت وطن کی عالم گیر — یہی گنہ ہے یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پنہائی ہے زنجیر — بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر
ہے دل میں درد مگر طاقتِ کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

نظم وطن کے راگ میں بھی اسی طرح کے خیالات پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز — ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز — چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اس بند میں بھی آزادیٔ گفتار اور اخبار پر پابندیوں کا نوحہ ہے اس کے علاوہ چکبست کی اس زمانہ کی غزلوں میں بھی انھیں خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اسکے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے
یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دُنیا میں — کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے
جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں — مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہَوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

ہوم رول کے علم بردار ہر حالت میں اور ہر وقت انگریز حکومت کے وفادار بنا چاہتے تھے کیونکہ یہ لوگ زیادہ تر اعتدال پسند طبقہ کے لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ اگر ہم اپنی مکمل وفاداری انگریزوں کے ساتھ ثابت کر دیں تو یہ مجبور ہو کر ہم کو آزادی دیں گے جس کے بعد اور آزادی کے لئے ہم جد وجہد کر سکتے ہیں اس کے علاوہ ہندوستانیوں کو ولایت کے رہنے والے انگریزوں سے اُمید تھی کہ اگر ان کو صحیح حالات کا علم ہو جائے تو وہ ہندوستانیوں کے ہم آواز ہو جائیں گے۔ چکبست بھی اسی خیال کے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جو اپنے حال پہ یہ بے کسی برستی ہے — یہ نائبانِ حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دُور جو برطانیہ کی بستی ہے — وہاں سُنا ہے محبّت کی جنس سستی ہے

جو اس پہ حالِ وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں بیڑا یہ پار ہو جائے

آگے بڑھ کے انگریزوں سے جو اُمید ہے اس کو صاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

جو اپنے دل سے ہے برطانیہ کا دل راضی — تو کیا کریں گے یہ ہندوستان کے قاضی
نہ کام آئے گی غیروں کی رخنہ اندازی — تمھیں پکار رہی ہے سخی کی فیاضی

بچی کھچی یہ قناعت ہے یوں نہیں پیتے
پلانے والا پلاتا ہے کیوں نہیں پیتے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے سیاسی خیالات کیا ہیں، ہر حالت میں خواہ رنج پر رنج کیوں نہ برداشت کرنے پڑیں ہم کو انگریزوں کا وفادار رہنا چاہیئے، اسی خیال کو چکبست برابر پیش کرتے ہیں ؎

فدائیانِ حکومت نے ہم کو رنج دیئے
مگر جو فرضِ وفا تھے ادا وہ ہم نے کیے
نثار جاں سے ہوئے آدابِ سلطنت کیلئے
شرابِ عیش سمجھ کر لہو کے گھونٹ پیے

ڈگے نہ پاؤں محبت کے نوکِ خنجر پہ
لہو کی مہر ہے اپنے وفا کے محضر پہ

اس بند میں انھوں نے پوری طرح اپنی وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے برابر یہ خیالات ظاہر کیے ہیں کہ ہم کو خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ برداشت کرنی ہو لیکن ہوم رول کے سامنے وہ سب ہیچ ہے۔ وطن کا راگ میں ان تکالیف کا ذکر ہے اور اپنی اُمید اور آرزو کا بیان ہے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جسکو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی دعا ہے وطن کے شکستہ حالوں کی
یہی اُمنگ جوانی کے نونہالوں کی
جو رہنما ہے محبت پہ مٹنے والوں کی
ہمیں قسم ہے اسی کے سپید بالوں کی

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اب ذرا اس فضا کو دیکھیے جو ہوم رول نے پیدا کر دی تھی ہے

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اُٹھے ابر جیسے دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

نگاہِ شوق سے اس رنگ کی تماشائی — ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی — چلے ہیں بہر زیارت وفا کے سودائی

وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا — رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا — دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی — تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی — غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لَو لگائے ہوئے

سنہ ۱۹۱۷ء تک ہندوستان کے عوام کا یہی پیغام تھا جیسا کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب اپنے مقالہ "پیامبر دورِ جدید" میں تحریر فرماتے ہیں[۵]:-

"تقریباً سنہ ۱۹۱۷ء تک ہندوستانی بیداری کا یہی پیام رہا کہ ہم میں وطن کی محبت پیدا ہو۔ وطن سے محبت پیدا کرنے والوں سے محبت پیدا ہو۔ ہندوستان کو ایک قومی حیثیت دی جائے اور انتظام ملکی میں ہندوستانیوں کا بھی ہاتھ ہو۔ ہماری سماجی زندگی میں مغرب کے میل سے کچھ اور وسعت پیدا ہو۔ کانگریس انقلابی نہیں، بلکہ اصلاحی رفتار سے بڑھ رہی تھی اس کی آواز میں وزن پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی فریاد میں تلخی محسوس ہونا شروع ہو چکی تھی لیکن بہت آہستہ آہستہ۔ ہندوستانی اپنے دوپر کوئی بوجھ لینے کو تیار نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ انگریز

---

۵ یادگارِ چکبست۔ مرتبہ آنند نرائن ملا۔ صفحہ ۱۳۵

مورخین اور مدبّرین کی تحریروں نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ وہ اس قابل ہی نہیں۔ قوم کی رہنمائی متوسط طبقہ کے اونچے لوگوں کے ہاتھ تھی اور ناخدائی کرنے والے آگے زیادہ دُور تک دیکھ نہیں رہے تھے چکبست اس ہندوستان کے شاعر تھے ان کا پیغام اس ہندوستان کا پیغام تھا جو اس وقت کے لحاظ سے کافی ترقّی پسند معلوم ہوتا تھا۔"

اس وقت بس ہوم رول کی آواز تھی اس زمانہ کا ہر شخص جذبۂ وطن سے سرمست نظر آتا ہے لیکن چونکہ لیڈر زیادہ وسیع النظر نہ تھے۔ اس وجہ سے وہ آج کی آزادی کے تصوّر سے مقابلہ میں بہت پیچھے تھی۔ چکبست ہندوستان کی بھلائی چاہتے تھے۔ وہ اس کو بلند ترین جگہ پر دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود وہ کوئی سیاسی مفکر نہ تھے۔ اور نہ کوئی نیا نظام ترتیب دے سکتے تھے۔ جیسا کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں[۵] :۔

"چکبست اسی دَور کے شاعر تھے وہ حب وطن سے مست و بے خود تھے۔ وہ ہندوستان کا بھلا چاہتے تھے وہ پرانی روشیں ترک کرنے پر اُکساتے تھے۔ وہ معاشرت میں تبدیلیاں چاہتے تھے۔ ان کے پاس ایک اثر انگیز زبان تھی اور ایک درد مند دل۔ اس لئے وہ اپنے پیاموں میں رنگا رنگ جلوے بھر دیتے تھے۔ وہ ان میں اپنے دل کی گرمی اور اپنے سینے کا گداز پیدا کر دیتے تھے۔ ہماری غلطی ہوگی اگر ہم چکبست کے یہاں کوئی بین الاقوامی نقطۂ نظر تلاش کریں اگر ہم ان کے یہاں کوئی سیاسی فلسفہ ڈھونڈیں اگر ہم ان سے عصرِ حاضر کے جمہوری نظریہ کا شاعرانہ بیان سننا چاہیں۔ ان کے جذبات اور خیالات اس ہندوستان سے وابستہ تھے جس میں گوکھلے اور بشن نرائن در کی آواز گونج رہی تھی اور جنھوں نے حب وطن کا درس دے کر ایک اصلاحی پروگرام ہندوستان کے سامنے رکھا تھا ......

---

[۵] یادگارِ چکبست - مرتبہ آنند نرائن ملا - صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۷

چکبست سیاسی مفکرین کی طرح کوئی نیا نظام ترتیب نہیں دے رہے تھے
بلکہ ہندوستانی رہنماؤں کے عام جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ وہ
انھیں کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ صرف اپنے شدتِ احساس
سے اسے پُر اثر بناتے تھے۔ شراب وہی تھی جو لیڈروں کے پیالے میں تھی
وہ اسے جوش دے کر دو آتشہ بناتے تھے۔"

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ چکبست سیاسی لیڈروں سے متاثر تھے اور ان کا خود کوئی پیام نہ تھا۔ چکبست اور اقبال میں یہی فرق ہے۔ اقبال پرانی عظمت کو یاد دلاتے ہیں حال کی بربادی کی وجہ بیان کرتے ہیں اور مستقبل کو درست کرنے کا خود ایک طریقہ بتاتے ہیں لیکن چکبست پرانی عظمت اور حال کی بربادی تو بیان کرتے ہیں لیکن مستقبل کے لئے خود کوئی ایسا طریقہ پیش نہیں کرتے جس سے مستقبل روشن اور شاندار ہو۔ وہ محض سیاسی لیڈروں اور مدبروں کے خیالات کی ترجمانی کر دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی سیاسی نظموں کے جائزے لینے پر صاف ہو جاتا ہے۔

نظم فریادِ قوم ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی۔ انگریز حکام نے جب ٹرانسوال جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر بے حد ظلم کئے تو ہندوستان میں کانگریس اور سیاسی رہنماؤں نے اس سے متاثر ہو کر ان کی حالت درست کرانے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ تشریف لے گئے۔ یہ نظم ایک رسالہ کی شکل میں الگ بھی چھپی تھی اور تمام ہندوستان میں تقسیم کی گئی تھی۔ اس نظم سے اس حالت کا مکمل پتا چل جاتا ہے۔ نظم جس انداز سے شروع ہوتی ہے وہی خون کے آنسو ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہے آج اور ہی کچھ صورت بیاں میری — تڑپ رہی ہے دہن میں تڑپ کے زباں میری
چھدیں گے قلب و جگر تیر ہے فغاں میری — لہو کے رنگ میں ڈوبی ہے داستاں میری

مبالغہ نہیں تمہید شاعرانہ نہیں
غریب قوم کا ہے مرثیہ فسانہ نہیں

پہلے ہی بند سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ قومی مرثیہ ہے۔ اب ذرا وہاں کے حکام کے ظلم

کا حال سنئے ؎

ٹرینسوال کے حاکم وفا شعار نہیں | کچھ انکے قول کا دنیا میں اعتبار نہیں
ہماری قوم پہ احسان کا انکے بار نہیں | یہ ظلم کیوں ہے ہم انکے گناہ گار نہیں

اگر وہ دولت برطانیہ کے پیارے ہیں
تو اہل ہند اسی آسماں کے تارے ہیں

مگر جفا سے نہیں ظالموں کو مطلق عار | اُجاڑے ہیں وہ بستی جو تھی کبھی گلزار
جہاں خوشی کے ترانوں کا گرم تھا بازار | سنائی دیتی ہے واں بیڑیوں کی اب جھنکار

کیا ہے بند مسافر سمجھ کے راہوں کو
پنہائی جاتی ہے زنجیر بے گناہوں کو

لٹے ہیں یوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں | نصیب رات کو پڑ رہنے کا مقام نہیں
یتیم بچّوں کے کھانے کا انتظام نہیں | جو صبح خیر سے گزری امید شام نہیں

اگر جیئے بھی تو کپڑا نہیں بدن کے لئے
مرے تو لاش پڑی رہ گئی کفن کے لئے

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے | ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے
تھیں، تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے | وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوارے

جو چُپ رہیں تو ہوا قوم کی بگڑتی ہے
جو سر اُٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

یہ ہے ٹرانسوال کے حکام کے ظلم کی تصویر۔ ہندوستانیوں پر ستم کی تصویر۔ جنوبی ہندوستان میں جو ہندوستانی آباد تھے ان کو سیاہ قوم کے نام سے یاد کرکے ان کی آزادی کو مکمل طور سے ختم کر دیا گیا تھا لیکن اسی پر حکام کو سکون نہ ہوا بلکہ ہندوستانیوں کے لئے بعض حصّوں میں داخل ہونا انگریزوں کے ساتھ ریل پر سفر کرنا۔ ان کے ساتھ ہوٹلوں میں بیٹھنا اور کسی بھی حالت میں انگریزوں کی برابری کرنے پر سخت ترین پابندیاں لگادی گئیں تھیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں جب گاندھی جی وہاں گئے تو باوجود اس کے کہ ان کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا ان کو ریل سے اُتار دیا گیا۔

اس کے بعد چکبست ہندوستان کے باشندوں کو غیرت دلاتے ہیں کہ شاید ان پر اثر ہو اور وہ ان ہندوستانیوں کی مدد کی کوشش کریں جو وطن سے دُور اور بہت دُور انگریزی حکام کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے۔ فرماتے ہیں ؎

اگر دلوں میں نہیں اب بھی جوش غیرت کا — تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزت کا
دفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا — جنازہ لے کے چلو قوم و دین و ملت کا
نشاں مٹا دو امنگوں کا اور ارادوں کا
لہو میں غرق سفینہ کرو مرادوں کا

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار — پکارتے ہیں مدد کے لئے در و دیوار
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار — زمین ہلتی ہے اُڑتا ہے خون بن کے غبار
جگہ سے اپنی ہے چتوڑ کی زمیں سر کی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

اس کے بعد ہندوؤں کو غیرت دلاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار — اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار — تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

جنھیں رُلائے نہ اب بھی یہ قوم کی اُفتاد — سیاہ قلب وہ ہندو ہیں کنس کی اولاد
مگر وہ کیا ہیں کسی کی بھی گر نہ ہو امداد — اثر دکھائے گی جادو کا قوم کی فریاد
اُٹھیں گے خاک کے تودے سے دستگیر اپنے
زمین ہند کی اُگلے گی سورمیر اپنے

پھر فوراً ہی مسلمانوں سے مخاطب ہو کر ان کو غیرت دلاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو — وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو — جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے وارث دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم

کرو خیال کچھ اسلام کی حمیت کا | دیا تھا دشمنِ قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا | یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروّت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

غور کیجئے کن الفاظ سے ہندؤں اور مسلمانوں کو غیرت دلائی جا رہی ہے بھیشم اور ارجن کی بہادری کے واقعات یاد دلائے جا رہے ہیں۔ اور اخیر میں جو سب سے زبردست چیز ہو سکتی ہے وہ کہی گئی کہ اگر اب بھی تم کو احساس نہ ہوا تو دنیا تم کو کنس کی اولاد کہے گی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو نبی کے خلق و مروّت کے وارث بنا کر دشمن کو جامِ شربت دینے کو اور اسلام اور عرب کی حمیّت یاد دلا کر ابھارنے کی کوشش کی اور اخیر میں یہاں پر بھی ایک نہایت پُر اثر مصرع چسپاں کیا ہے کہ اگر اب بھی بیدار نہ ہوئے تو "ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی"

اس نظم کا آخری بند چکبست کی زبردست آرزو اور حمیت کا آئینہ ہے، فرماتے ہیں ؎

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے | نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے | نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

غور کیجئے کس کس طرح سے ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی زمانہ کی دوسری نظم "قوم کے سورماؤں کو الوداع" ہے۔ یہ نظم اس زمانہ میں تصنیف کی گئی تھی جب ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ کی جانب سے یورپ کی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) میں حصہ لینے کے لئے روانہ کی جا رہی تھی ممکن ہے آج کوئی شخص سوال کرے کہ انگریز جو ہندوستان کے زبردست دشمن تھے، ان سے یہ ہمدردی کیوں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ہندوستانی اس زمانہ تک انگریزوں کے زیر سایہ حکومت کے کچھ اختیارات چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ بھی تھا کہ اگر ہندوستان کے عوام کی وفاداری انگریزوں نے محسوس کر لی تو وہ خوش ہو کر ہم کو اندرونی معاملات میں آزادی دیں گے۔ اس طرح سے اس وقت سب کے

بڑی خواہش یہ تھی کہ ولایت کی سرکار ہندوستانیوں کی وفاداری اور خدمت سے متاثر ہو اور اس سلسلہ میں ہندوستان کو آزادی نصیب ہو۔ نظم کو شروع کرتے ہوئے ہندوستانی سپاہیوں کا تعارف کراتے ہیں۔ اس میں سے ایک طرف جذبہ حب وطن نمایاں ہے دوسری طرف انیس مرحوم کے اندازِ بیان کا تتبع۔ فرماتے ہیں ؎

ساحلِ ہند سے جرارِ وطن جاتے ہیں — کچھ نئی شان سے جانبازِ کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں — تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

ان کی رگ رگ میں ہیں پیوست شجاعت کے چلن — رن کا میدان ہے انکے لئے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت انکو ہے اک شب کی دلہن — مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن
جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دور نہیں
ساتھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

یہ جانے والے کوئی معمولی انسان نہیں اور نہ معمولی حالت سے جاتے ہیں۔ یہ وہ سپاہی ہیں جو تیغ زن۔ برق فگن، قلعہ شکن، جو شجاعت کے پیکر ہیں اور جن کے لئے میدانِ جنگ محض ماں کا دامن ہے۔ آج یہ سپاہی میدانِ جنگ کے لئے رواں ہیں۔ الفاظ کے استعمال کا کمال نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انیس مرحوم کا کوئی بند کسی مرثیہ سے الگ کر کے یہاں پیش کر دیا گیا ہے۔ تعارف کے بعد سپاہیوں کے حوصلہ کو بلند کیا جاتا ہے۔ چند بند دیکھئے ؎

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا — طنطنۂ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا — ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا
یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لئے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

جاں نثار آج تمہارا سا زمانہ میں نہیں — ہاں دکھا دو کہ ہو تاج شہ لندن کے نگیں
دوست کیا چیز ہیں دشمن ہوں فدائے تحسیں — آسماں وجد کرے بول اٹھے ان کی زمیں

یوں تو لڑنے کو بہت سے تھے گئے خوار لڑے
اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار لڑے

اس کے بعد اپنے ہم وطنوں کو رائے دیتے ہیں اور ساتھ ہی حمیّت بھی دلاتے جاتے ہیں کہ جس وقت معرکہ جنگ پیش آئے تو اس وقت اس طرح سے لڑنا چاہیے کہ سارا عالم یہ پکار اٹھے کہ ہاں اس طرح سے بہادر لڑتے ہیں اور واقعی اسی ملک میں ارجن، بھیم اور بھیشم جیسے بہادر گزرے ہیں ؎

جس گھڑی معرکہ جنگ میں ہو تیغ علم
سورما لڑتے ہیں اس طرح پکارے عالم
دل ہو ارجن کا جگر بھیم کا انگد کا قدم
موت کے وقت نظر میں ہو شبیہ بھیشم
جس کا قابو نہ ہٹا موت کی تدبیروں پر
سایۂ تیغ میں آرام کیا تیروں پر

ہو وہ یورش کہ ہو شیرازۂ اعدا برہم
اک امنڈتے ہوئے دریا کا ہو پیدا عالم
جو کسی سے نہ جھکا وہ سر مغرور ہو خم
پہلے برلن میں جو پہونچے وہ تمھارا ہو قدم
"وہ گرو" کہہ کے بڑھو خون کے مخفر کھل جائیں
پھر ہری سنگھ کی تلوار کے جوہر کھل جائیں

اس کے بعد کہتے ہیں کہ تمھارا یہ اعزاز قوم کا اعزاز ہے اور یہ بات تم کو ثابت کرنا ہے ؎

تم کو اعزاز ملا ہے یہ وطن کا اعزاز
دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمھاری انداز
خاک یورپ پہ دلیری سے ہو اپنی ممتاز
تیغ ہندی کی اصالت پہ زمانہ کو ہو ناز
قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو
روح پرتاپ کی جنّت میں نہ شرمندہ ہو

لیکن حوصلہ کو بلند کرنے کے ساتھ وہ انسانیت اور شرافت کی بھی تبلیغ کرتے جاتے ہیں۔ سپاہیوں کو سختی سے منع کرتے ہیں کہ بے گناہوں کا لہو نہ بہائیں اور کوئی حرکت تہذیب سے گری ہوئی نہ کریں ؎

گو کہ دنیا سے مٹے شوکت قیصر کا سراغ
شعلہ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گل نہ ہو دل کے شوالے میں حمیّت کا چراغ
بے گناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں داغ

راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کے لئے
خونِ معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کے لئے

نظم کے آخری بند میں مادرِ قوم کا اپنے سپوتوں کے نام جو پیام ہے وہ بھی چکبست کے دل کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے ؎

مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام
خطۂ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام
تیغ خونریز نے جس شان سے چھوڑا ہے نیام
اپنے مسکن میں اسی شان سے پاتے آرام
شاعرِ گوشہ نشیں شکرِ خدا کرتا ہے
جنگ ہو تم کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

۱۹۱۶ء کی دو نظمیں "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" اور "وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک" کو بظاہر بچّوں کے گانے کے لئے لکھی گئی ہیں لیکن یہ بھی چکبست کے سیاسی مشرب کا آئینہ ہے۔ شاعر اپنی انفرادیت کے ساتھ ہر جگہ جلوہ گر نظر آتا ہے وہی جذبہ حب وطن سرمست کئے ہوئے ہے اور اسی کا نشہ بچّوں پر بھی چڑھانا مقصود ہے۔ نظم "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" میں کہتے ہیں ؎

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن
محبّت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

اس کے بعد وطن کے باغ۔ درخت پھول اور پھل کا ذکر کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وطن کی ہر چیز سے اپنی محبّت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ کبھی ہوا کا ذکر ہے تو کبھی ساون کی کالی گھٹا سے متاثر ہیں۔ کبھی برسات کی ہلکی ہلکی پھوار ہے تو کبھی گنگا اور جمنا کے زور سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کبھی کوئل کی کوک دل کو مست کئے ہے تو کبھی مور کا حسن اپنی طرف متوجّہ کئے ہے مختصر یہ کہ شاعر اپنے وطن سے ہر طرح سے متاثر اور محبّت کرتا ہوا نظر آتا ہے اور آخیر میں اس کا اظہار یوں کرتا ہے ؎

اسی سے ہے اس زندگی کی بہار
وطن کی محبّت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

"وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک" میں بھی اسی طرح کے خیالات

ظاہر کئے گئے ہیں۔ اس نظم میں بھی خاک وطن کیمیا اور سونے سے زیادہ قیمتی نظر آتی ہے۔ چڑیاں۔ کوئل۔ پپیہے۔ بادل۔ جنگل۔ پھول۔ چشمے۔ گنگا۔ جمنا۔ غرض کہ ہر وہ چیز جس کا وطن سے تعلق ہے وہ ان کو عزیز نظر آتی ہے۔ آخری شعر میں فرماتے ہیں ؎

وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام　　　اسی مٹی میں وہ کرتے ہیں آرام
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

ان اشعار سے ان کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں وہ ہر حالت میں جذبہ حب وطن سے سرشار رہیں۔

اسی حصّہ کی نظم "نالۂ درد" ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی۔ اس وقت کانگریس کے اندر دو حصّے ہو گئے تھے اور تلک کے گروہ کی وجہ سے بہت سے پرانے لیڈر کانگریس سے الگ ہو گئے تھے۔ چکبست جن کا نظریہ تھا کہ سب ہندوستانی ایک ہو کر ملک کی آزادی کے لئے جد و جہد کریں ان کا دل اس اختلاف سے حد سے زیادہ متاثر ہوا اور انھوں نے یہ نظم لکھی۔ پہلے شعر میں لیڈروں کے مختلف الرائے ہونے کا ذکر کیا ہے ؎

دل نہ اپنے راگ سے کان آشنا ہونے کو ہیں　　　پردہ ہائے ساز قومی سے صدا ہونے کو ہیں

اس کے بعد یہ فکر دامن گیر ہے کہ خدا معلوم جب لیڈروں میں اتنے زیادہ اختلافات ہیں تو کون ہندوستان کی رہنمائی کرے گا۔ کیونکہ ہر ایک اپنے کو سب سے بڑا لیڈر تصور کرنے لگا تھا۔

رہنمائی کس کی ہو گی مجھ کو حیرت ہے یہی　　　قافلہ میں قوم کے سب پیشوا ہونے کو ہیں

۱۹۱۵ء میں گوکھلے کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد سے تلک کا زور بڑھنے لگا تھا۔ چکبست خود اعتدال پسند طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن تلک وغیرہ نے گوکھلے اور ان کے ہم خیال حضرات پر اعتراضات شروع کر دیے تھے کہ یہ لوگ وطن کی آزادی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ چکبست خود اس اعتراض سے بیحد متاثر ہوئے ہیں جس کا مکمل اظہار اس نظم سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جذبۂ خدمت صفائے قلب آئین ادب　　　خود نمائی پر یہ سب جوہر فدا ہونے کو ہیں

مانگتی ہے روز جس سے روشنی صبح وطن ۔ خون کے قطرے ان آنکھوں سے جدا ہونے کو ہیں
مسندوں نے اپنے جو سینچا کئے باغِ وطن ۔ بے وفائی کے انھیں خلعت عطا ہونے کو ہیں
اب تلک پر چوٹ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ اب لیڈر ہو جائیں گے ۔
جنکو منزل سے زیادہ ہے ہوا کا رُخ عزیز ۔ قوم کے بیڑے کے ایسے ناخدا ہونے کو ہیں
اس کے بعد پھر جو حضرات داہنے بازو کے بانی ہیں ان کے متعلق فرماتے ہیں ۔
یادگارِ دورِ آخر ہیں جو کچھ حرماں نصیب ۔ وہ اسیر کاوش جرم وفا ہونے کو ہیں
جو کچھ ہو رہا ہے اور ہونے جا رہا ہے اس کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے ان اختلافات کے آخری نتیجہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۔
گرچہ یہی ہے گردشِ دوراں کا رنگ انقلاب ۔ ہوش اُڑ جائیں گے وہ فتنے بپا ہونے کو ہیں
جراتِ اخلاق تیرے امتحاں کا وقت ہے ۔ خود عزیزانِ وطن ہم سے خفا ہونے کو ہیں

مادرِ ناشاد روتی ہے کوئی سنتا نہیں
دل جگر سے بھائی سے بھائی جدا ہونے کو ہیں

نظم کے عنوان ہی سے پتا چلتا ہے کہ یہ چکبست کے خون کے آنسو ہیں جو اس نظم کی شکل میں نمودار ہوئے ہیں ۔ ۱۹۱۱ء میں پنڈت مدن موہن مالوی اور ان کے ساتھیوں نے بنارس یونیورسٹی کی حالت درست کرنے کے لئے سارے ہندوستان کا دورہ کیا کہ چندہ جمع کریں ۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں ان حضرات کی آمد پر ایک زبردست جلسہ ہوا ۔ چکبست نے اس موقع پر اپنی نظم "قومی مسدس" پڑھی جو اس موقع کے لئے لکھی گئی تھی ۔ اس نظم سے ایک طرف تو پنڈت مالوی نیز دیگر حضرات کے متعلق چکبست کے خیالات کا علم ہوتا ہے دوسری طرف تعلیم کی کمی اور اس کے گراں قیمت ہونے کا پتا چلتا ہے ۔ نظم ان ہی بزرگوں کے تعارف سے شروع ہوتی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

الٰہی کون فرشتے ہیں یہ گدائے وطن ۔ صفائے قلب سے جنکے یہ بزم ہے روشن
جھکی ہوئی ہے سبھو کی لحاظ سے گردن ۔ ہر اک زباں پہ ہیں تعظیم و ادب کے سخن

صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی
خدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی

فقیر علم کے ہیں ان کی داستان سن لو — پیام قوم کا دکھ درد کا بیان سن لو
یہ دن وہ دن ہے جو ہے یادگار یہاں سن لو — ہے آج غیرتِ قومی کا امتحاں سن لو
یہی ہے وقت امیروں کی پیشوائی کا
فقیر آئے ہیں کاسہ لئے گدائی کا

ان فقیروں کی بھی تعریف ہوتی ہے کہ یہ کون فقیر ہیں یہ وہ نہیں جو اپنی خواہش پوری کرنے کے واسطے کچھ مانگیں بلکہ ؎

جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں — طمع میں دولتِ دنیا کی یہ اسیر نہیں
امیر دل کے ہیں ظاہر کے یہ امیر نہیں — وہ آدمی نہیں ان کا جو دستگیر نہیں
تمام دولتِ ذاتی لٹائے بیٹھے ہیں
تمہارے واسطے دھونی رمائے بیٹھے ہیں

اس کے بعد یہ بتلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان حضرات کا عوام سے کیا سوال ہے اور کس غرض سے یہ یہاں آئے ہیں ؎

سوال ان کا ہے تعلیم کا بنے مندر — کلس ہو جس کا ہمالہ سے اوج میں برتر
اسی امید پہ یہ گھومتے ہیں شام و سحر — صدا لگاتے ہیں راہِ خدا میں یہ کہہ کر
وہ خود غرض ہیں جو دولت پہ جان دیتے ہیں
وہی ہیں مرد جو ودیا کا دان دیتے ہیں

اس وقت تعلیم بے حد گراں ہوتی چلی جا رہی تھی اس لئے اس کا بھی ذکر کرنا ضروری تھا۔ فرماتے ہیں ؎

جو ہو رہا ہے زمانہ میں ہے تمہیں معلوم — کہ ہو گئے ہیں گراں کس قدر فنون و علوم
تمہاری قوم سے دولت ہوئی ہے یوں معدوم — کہ اب ترستے ہیں پڑھنے کو سیکڑوں معصوم
وہ خود ترستے ہیں ماں باپ انکے روتے ہیں
تمہاری قوم کے بچے تباہ ہوتے ہیں

اس وقت تک مسز بسنٹ تعلیم کی اصلاح اور اس کو فروغ دینے کا جد و جہد کر رہی تھیں اور انھوں نے اپنی ہوم رول تحریک بھی شروع نہ کی تھی اس جلسہ میں وہ بھی تشریف لائیں اور تقریر کی۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مسز بسنٹ کے احسان کی تمھیں ہے خبر
کیا نثار بڑھاپا تمھارے بچوں پر
شریک وہ بھی ہیں اس کار خیر کے اندر
نہ انکی آنکھ ہو نیچی رہے یہ مد نظر
مٹے نہ بات کہیں تم پہ مٹنے والوں کی
تمھارے ہاتھ ہے شرم ان سفید بالوں کی

مسز بسنٹ کے بعد فوراً مالوی جی کا پاس ولحاظ کرنے کی تلقین فرماتے ہیں ؎

تمھارے واسطے لازم ہے مالوی کا پاس
کہ جسکی ذات سے اٹکی ہوئی ہے قوم کی آس
کیا غریب نے گھر بار چھوڑ کر بن باس
جو یہ نہیں ہے تو کہتے ہیں پھر کسے سنیاس
تمام عمر کٹی ایک ہی قرینے پر
گرا دیا اپنا لہو قوم کے پسینے پر
اسی کے ہاتھ میں ہے قوم کا سنور جانا
تمھاری ڈوبتی کشتی کا پھر ابھر آنا
جو تم نے اب بھی نہ دنیا میں کام کر جانا
تو یہ سمجھ لوکہ بہتر ہے اس سے مر جانا
غضب ہوا جو دل اسکا بھی تم سے ٹوٹ گیا
گر اس آنکھ سے آنسو تو نام ڈوب گیا

اس کے بعد ہندوستانی عوام کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش ہوتی ہے ؎

گھٹائیں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ و تار
یہ آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار
مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوئے بیدار
تو جان لو کہ یہ ہے اس قوم کی چتا تیار
مٹے گا دین بھی اور آبرو بھی جائے گی
تمھارے نام سے دنیا کو شرم آئے گی

آخر میں چندہ کی اپیل ایک انداز خاص سے کی گئی ہے کیونکہ یہ نظم اسی موقع کے واسطے لکھی گئی تھی۔ کہتے ہیں ؎

یہ کار خیر وہ ہو نام چار سو رہ جائے
تمھاری بات زمانہ کے روبرو رہ جائے
جو غیر ہیں انھیں ہنسنے کی آرزو رہ جائے
غریب قوم کی دنیا میں آبرو رہ جائے
ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو
فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھر دو

یہاں سے جائیں تو جائیں یہ جھولیاں بھر کر — لٹائیں علم کی دولت تمھارے بچوں پر
ادھر یہ ناز ہو تم کو کہ خوش گئے یہ بشر — جو ہو سکا وہ کیا ان کی نذر ٹیک کے سر

یہی ہو فخر جوانوں کا اور پیروں کا
سوال رد نہ کیا قوم کے فقیروں کا

یہ نظم بھی چکبست کے جذبۂ حب وطن اور اصلاحی خیالات کو پوری طرح سے نمایاں کرتی ہے۔ دراصل چکبست کی تمام شاعری کی جان جذبہ حب وطن ہے جو مختلف انداز میں نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنی نظم "گائے" تصنیف فرمائی ہے۔ گائے کے لئے ہندوستانیوں اور خاص کر ہندوؤں کے دل میں جو جذبہ ہے وہ اس کے ہر ہر لفظ سے نمایاں ہے۔ ساری نظم محبت اور خلوص کے الفاظ سے پُر ہے۔ وہ گائے کو قومی عزت کا نشان تصوّر کرتے ہیں اور اسی حیثیت سے اس کی عزت چاہتے ہیں ؎

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں — چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں — ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منھ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

اس کے بعد وہ بیان کرتے ہیں کہ تو ہی نہیں بلکہ تیرے بچوں کا بھی احسان ہندوستان کے عوام پر زبردست ہے۔ ہندوستان کے عوام زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور چونکہ اس وقت مشینوں کا زور بالکل نہ تھا صرف بیل کی مدد سے زمین جوتی جاتی تھی۔ چکبست نے یہ بند لکھا تھا ؎

ترے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار — اپنی گردن پہ لیا پرورشِ قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار — ہے یہ سب انکے لہو اور پسینے کی بہار

ان کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اُگلتی نہ خزانا اپنا

اس کے بعد پھر گائے کے دودھ سے فائدے کا ذکر کرنے کے بعد اپنا ذاتی خیال پیش کرتے ہیں ؎

میرے دل میں ہے محبت کا تری سرمایا | ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر مجھے تیرا سایا
یاد ہے فیضِ طبیعت نے جو تجھ سے پایا | عین قسمت جو تیرا نام زباں پر آیا

اس حلاوت سے جو دعوئ سخن گوئی ہے
دودھ سے تیرے لڑکپن میں زباں دھوئی ہے

اس آخری بند میں انھوں نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے کہ آخر وہ گائے کو ماتا کیوں کہتے ہیں اور اس کی اس قدر عزت کیوں کرتے ہیں۔

ان کی دو نظمیں "سیر دہرہ دون" اور "آصف الدولہ کا امام باڑہ (لکھنؤ)" منظر نگاری کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے جذبۂ قومیت کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ان کو فخر ہے کہ سرزمین ہند پر اس طرح کی چیزیں موجود ہیں جو خود آپ اپنی نظیر ہیں اور یہ چیز باعثِ فخر ہے "سیر دہرہ دون" ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں ایک قسم سے منظر نگاری کی گئی ہے۔ شاعر مختلف چیزوں کے حسن سے متاثر ہوتا ہے اور ان کو نظم کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سے کچھ اقتباسات آئندہ صفحات میں پیش کئے گئے ہیں۔

دوسری نظم آصف الدولہ کا امام باڑہ (لکھنؤ) ہے یہ امام باڑہ نواب آصف الدولہ نے بنوایا ہے۔ ان کی حکومت میں ایک مرتبہ بڑا زبردست قحط پڑا۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے۔ نواب نے عوام کی مدد کرنی چاہی لیکن عوام نے مدد لینے سے انکار کیا کہ بغیر محنت کئے ہم پیسہ نہ لیں گے، آخر نواب نے اس امام باڑہ کو بنوانا شروع کیا۔ یہ تمام دن اور رات بنتا تھا۔ آج بھی یہ لکھنؤ کی سیر کرنے والے حضرات کے لئے خاص کشش کا مرکز ہے۔ اس امام باڑہ میں نوابی کے زمانہ میں محرم کی پہلی سے دس محرم تک روز مخصوص قسم کی روشنی ہوتی تھی لیکن اس کے بعد سے اب صرف آٹھ اور نو محرم کو خاص طور پر روشنی ہوتی ہے، اور سیکڑوں حضرات اس کو دیکھنے جاتے ہیں۔ اس عمارت کی تعریف یہ ہے کہ باوجود اتنی بڑی عمارت ہونے کے جس میں متعدد ہال بھی ہیں، تمام عمارت میں لکڑی یا لوہے کا نام نہیں۔ اس حیثیت سے دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی چکبست کو اس پر فخر ہے کہ ان کے ہند میں ایک ایسی عمارت ہے جس کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔

آصف الدولۂ مرحوم کی تعمیر کہن ‏ ‏ جس کی صنعت کا نہیں صفحۂ ہستی پہ جواب

اس کو جب سیاح دیکھنے آتے ہیں تو ان کو یہ عمارت کس قدر وجیہہ اور پروقار نظر آتی ہے۔ اور خاص کر شب کے سناٹے میں۔ یہاں بھی چکبست کی تصویر کشی قابل دید ہے ؎

دیکھ سیاح اسے رات کے سناٹے میں ‏ ‏ منھ سے اپنے مہِ کامل نے جب اُلٹی ہو نقاب

در و دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک ‏ ‏ سحر کرتی ہے نگاہوں پہ چھلکے مہتاب

یہی ہوتا ہے گماں خاک سے مس اسکو نہیں ‏ ‏ ہے سنبھالے ہوئے دامن میں ہوائے شاداب

یک بیک دیدۂ حیراں کو یہ شک ہوتا ہے ‏ ‏ ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اتر آیا ہے سحاب

بیخودی کہتی ہے آیا یہ فضا میں کیونکر ‏ ‏ کسی اُستاد مصور کا ہے یہ جلوۂ خواب

اک عجب منظرِ دلگیر نظر آتا ہے

دور سے عالمِ تصویر نظر آتا ہے

نواب آصف الدولہ بہادر کی قبر امام باڑہ کے ہال میں ہے اس طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

جسکے فیضانِ حکومت کا کرشمہ ہے یہ ‏ ‏ اسکے سایہ میں ہے سویا ہوا وہ خلق نواز

اس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اسکی ‏ ‏ اسکے اخلاق کے وسعت کا ہے اسمیں انداز

وہ نواب آصف الدولہ بہادر کو ایک ہندوستانی کی حیثیت سے عزت دیتے ہیں اور ساتھ میں ان کی اس زبردست عمارت اور اس کی بلندی کے قائل نظر آتے ہیں۔

چکبست نے شری کرشن جی کی یوم پیدائش "کرشن کنھیا" نظم لکھی ہے۔ ہندو اعتقادات کے لحاظ سے پوری نظم کرشن جی کی زندگی کا آئینہ ہے۔ لیکن چکبست ان کو ایک ملکی ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ خاص کر جب وہ مہابھارت کے میدان میں ارجن سے موت اور زندگی کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ اور کرشن جی نے ان کو موت اور زندگی کا فلسفہ بتایا اور سمجھایا کہ روح اور قلب کا الگ ہو جانا اسی طرح سے ہے جس طرح سے مسافر سفر میں کپڑے بدلے۔ انسان کی نیت اچھی ہونی چاہیے۔ اور اس کے بعد اس کو انجام کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ اس

کو چکبست نظم میں پیش کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :-

دیکھ کر جنگ کے طوفان میں ارجن کو اُداس
یوں دیا وعظ کہ ہوشیار ہوئے کشتہ یاس

روح قالب کی جدائی پہ عبث ہے وسواس
جو مسافر ہے وہ منزل پہ بدلتا ہے لباس

رُوح دنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے
اس سفر میں جو کھٹکتا ہے وہ کانٹا دل ہے

صاف نیت ہے تو بیکار ہے انجام کا ڈر
پاک بندے جو ہیں رکھتے ہیں فقط حق پہ نظر

خود ریاضت کو سمجھتے ہیں ریاضت کا ثمر
پھل کے لالچ میں لگاتے نہیں نیکی کا شجر

انکی آنکھوں میں وہی داغ وفا پیارے ہیں
خود غرض کے لئے جو آگ کے انگارے ہیں

کس لئے خاک کے پتلوں کیلئے روتا ہے
دیکھنے کو ہے کھلی آنکھ مگر سوتا ہے

کچھ خبر ہے تجھے کیوں جان عبث کھوتا ہے
کون آتا ہے فنا کون فنا ہوتا ہے

دوست دشمن کا مددگار وہی جنگ میں ہے
ایک صورت گر ہستی ہے جو ہر رنگ میں ہے

اور اخیر میں کرشن جی نے جو زبردست نصیحت ارجن کو دی وہی ان کی زندگی کا اصلی مقصد تھا :-

تیری آنکھوں سے اگر دُور ہو مایا کی نقاب
دیکھ پھر کیا نظر آتے ہیں عزیز اور احباب

بیوفاؤں کی مروّت میں نہ کر عمر خراب
حق پرستوں کی امانت ہے تراز و رشباب

دھرم پر جو نہ فدا ہو وہ جوانی کیا ہے
دودھ کی دھار ہے تلوار کا پانی کیا ہے

اور اخیر میں کہتے ہیں اب نہ ارجن باقی ہیں اور نہ کرشن جی لیکن کرشن جی کی عنایات باقی رہ گئی ہیں جو ہندوستان اور ہندوستانیوں دونوں کے لئے باعث فخر ہیں۔

چکبست کے اگر سارے کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا

کہ وہ جذبۂ حب وطن سے پوری طرح سرشار تھے۔ ان کے کلام میں یا تو سیاسی
اور قومی نظمیں ہیں۔ وطن سے محبت کرنے والے لیڈروں کا نوحہ ہے۔ انگریزوں
کے ظلم و تشدد کا بیان ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ سلسلہ خالی نظموں تک نہیں بلکہ
غزلیں بھی اس اثر سے خالی نہیں۔ بعض بعض غزلیں تو بالکل ہی سیاسی ہیں
انھوں نے اپنے دیوان کا نام صبح وطن اسی رعایت سے رکھا کہ اس میں وطن
سے متعلق۔ اس پر شیدا ہونے والوں کے متعلق اور وطن کے عام حالات سے
یہ دیوان پُر ہے یہ رسالہ جسے انھوں نے نکالا اس کا بھی نام "صبح امید" رکھا۔
وہاں اُمید کی جھلک اور امید بھی کس چیز کی۔ محض آزادی وطن کی اُمید
نظر آتی ہے۔

غزل گوئی

اُردو شاعری میں صرف غزل کی ایک ایسی صنف شاعری ہے جو ہر حالت میں اپنی روایات کو سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ اسے چھوڑنے کا خیال بھی اسے گراں گزرتا ہے۔ اس وجہ سے غزل میں جدّت کی تلاش آسان نہیں۔ اس کے باوجود زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور جن سے انسان ہر حالت میں متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کو غزل نے اکثر لبیک۔ کہا ہے جو غزل میں تغیّر کی صورت میں نمایاں ہوئے ہیں اور انھیں تبدیلیوں نے غزل میں جدید سے جدید تر رجحانات پیش کئے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود غزل کی ظاہری صورت اور ہیئت میں کم تبدیلی ہوئی۔ تبدیلی تمام تر خیالات میں ہوتی رہتی ہے۔ غزل کا اصل موضوع عشق و محبّت ہے۔ لیکن جب اس میں وسعت پیدا ہونی شروع ہوئی تو پہلے اس نے تصوّف کو اپنایا اور دراصل اسی تصوّف نے داخل ہو کر غزل کو دوسرے موضوعات داخل کرنے کے قابل بنایا۔ اس کے بعد سے غزل میں مختلف تغیّرات نظر آتے ہیں، جو غزل کو زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے کے قابل بناتے ہیں اور یہی نئے نئے راستے اور رجحانات اس کو جدّت کا رنگ دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی حکومت کے زوال اور انگریزوں کی آمد آمد سے نئے سیاسی اور سماجی حالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اُردو غزل میں جدّت کا رنگ، انھیں سیاسی اور سماجی حالات کی تبدیلی کا بہ تو ہیں۔ مغل سلطنت کی زوال پذیری افراتفری۔ اُداسی اور سوگواری نے عام طور پر وہ حالت پیدا کر دی جو قنوطیت کی شکل میں اُردو غزل میں نمایاں ہوئی۔ ان اثرات نے بے ثباتی دنیا کے خیالات عام کیے۔ اور خوشی کے تصوّر کو بھی ختم کر دینے کی کوشش کی۔

۱۸۰۳ء سے انگریزوں کے قدم دلی میں جمتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ

زندگی میں ایک زبردست قسم کا انقلاب آنے لگتا ہے۔ سیاسی۔ تہذیبی۔ معاشرتی اور معاشی زندگی نے بڑے اہم اثرات قبول کیے جن کا لازمی اثر ادب پر ہوا۔ خاص طور پر اردو غزل کو ان حالات نے بیحد متاثر کیا۔ اسی زمانہ میں مسلمانوں کے انحطاط اور زوال نے ایک کروٹ لی۔ مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی شخصیتوں نے عام مسلمانوں کے دلوں میں ایک عام ولولہ پیدا کر دیا۔ جمود میں حرکت پیدا ہوئی۔ افراد عمل کی طرف راغب ہوئے۔ زندگی بدلنے لگی۔ شعر و ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حکیم مومن خاں مومن کی مثنوی بہ مضمون جہاد ان حالات اور خیالات کی آئینہ ہے۔ اس مثنوی میں جو ولولہ انگیزی اور حوصلہ افزائی ہے، اُردو ادب اس وقت تک اس سے بالکل آشنا نہ تھا۔ مومن کے علاوہ غالب کی زندگی اور فن دونوں پر اس بیداری کے اثرات نمایاں ہیں۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب صرف سیاسی نہ تھا بلکہ اس نے ہندوستانیوں کی سماجی علمی۔ تہذیبی۔ تعلیمی ہر طرح کی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقائے کار کی تحریک ان تبدیلیوں کا پرتو ہیں۔ مولانا سید احمد بریلوی اور اسمٰعیل شہید کا اثر اب بڑے پیمانہ پر سر سید کی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا۔ سر سید کی نظر اتنی وسیع تھی کہ انھوں نے اپنے رفقائے کار میں حالی مرحوم کو ادب کی اصلاح سپرد کی۔

حالی نے جو جدید شاعری کے معماروں اور اُردو ادب کے مصلحوں میں شمار کئے جاتے ہیں اُردو غزل کو شاعری کی جان سمجھا اور اس کی اصلاح کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوئے۔ انھوں نے غزل کے موضوع کو انتہائی درجہ تک وسعت دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے زندگی کے ہر مسئلہ کو خواہ وہ سیاسی ہو یا تہذیبی، معاشی ہو یا معاشرتی، اخلاقی ہو یا عاشقانہ، غزل کا موضوع بنانا چاہا۔ عشق کی اہمیت کے وہ بیحد قائل ہیں۔ لیکن وہ اس میں صداقت اور خلوص و اصلیت بھی چاہتے ہیں۔ وہ عشق کے بلند تصورات کی ترجمانی غزل میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ محبت میں بھی وسعت چاہتے ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری میں فرماتے ہیں[1]:-

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی صفحہ ۔ ۱۹۳۳ء مطبوعہ رام نرائن لال پبلشر الہ آباد

"بندہ کو خدا کے ساتھ۔ اولاد کو ماں باپ کے ساتھ۔ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ۔ بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، خاوند کو بی بی کے ساتھ۔ بی بی کو خاوند کے ساتھ۔ نوکر کو آقا کے ساتھ۔ رعیت کو بادشاہ کے ساتھ۔ دوستوں کو دوستوں کے ساتھ۔ آدمی کو جانور کے ساتھ۔ مکین کو مکان کے ساتھ۔ وطن کے ساتھ۔ ملک کے ساتھ۔ قوم کے ساتھ۔ خاندان کے ساتھ۔ غرضکہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دلبستگی ہو سکتی ہے۔ پس جبکہ عشق و محبت میں اس قدر احاطہ اور جامعیت ہے اور جب کہ عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا بتا بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کر دیا جائے اور ایسے سرِ مکتوم کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کی جائے۔ اسی لئے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھُلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔"

اس کے علاوہ مولانا حالی مرحوم غزل میں خیالات کی بھی وسعت چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلسل غزلوں میں عشق و محبت کے خیالات کے ساتھ ساتھ طولانی مضمون بھی باندھنے چاہئیں۔ فرماتے ہیں[1]:۔

"ایسے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو ان میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے۔ غزل لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر طرح بہ طرح کے کھانے میسر آئیں تو وہ تمام عمر ایک

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی صفحہ ۱۲۷، ۱۹۳۱ء مطبوعہ رام نرائن لال پبلشر الہ آباد

ہی کھلانے پر قناعت کر سکتا ہے لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلوّن اور تنوع نہ ہوان سے جی اُکتا جاتا ہے۔ جو گویا صبح شام رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے۔ اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے اس طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے"

حالی نے خود اپنی غزلوں کو اسی رنگ میں پیش کیا۔ انھوں نے قومی اور ملّی مسائل کو اپنا محبوب موضوع بنا کر غزل کو ان سے آشنا کیا۔ اس سے غزل میں داخلیت کا پہلو کم ہو کر خارجیت کا پہلو غالب آگیا اور ایک واعظانہ کیفیت نمایاں ہو گئی لیکن جس مقصد کے پیش نظر انھوں نے یہ اہم قدم اٹھایا وہ اسکی تلافی کرتا ہے۔ وہ غزل میں مضامین کے اعتبار سے وسعت دینا چاہتے تھے۔ اسی لئے اس کا راستہ بنایا اور خود چل کر لوگوں کو دکھا دیا کہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اسمیں اصلیت ہے۔ واقعیت حقیقت ہے۔ ان تبدیلیوں میں سادگی ضرور ہے لیکن ایک پرکاری اور کیفیت بھی موجود ہے حالی کی اس جدت پسندانہ تحریک نے اپنے ہمہ گیر اثرات اُردو شاعری پر ڈالے ہیں۔

انیسویں صدی جاتے جاتے ایک زبردست انقلاب کے اثرات چھوڑ جاتی ہے یہ اثرات دراصل سرسید کی علی گڈھ تحریک سے شروع ہوئے لیکن شدّت ان کے آخری دَور میں آئی۔ اس انقلاب نے ہندوستانیوں کی زندگی میں زبردست تبدیلی پیدا کردی۔ عوام سیاست سے دلچسپی لینے لگے۔ کانگریس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ انگریزوں کے خلاف جذبات دھیرے دھیرے پیدا ہونے لگے تھے۔ آزادی کے بیج سے پودا نکلنے لگا تھا اور اس کی جڑیں مضبوط ہونے لگی تھیں۔ قومی اور وطنی روایات سے عوام کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔ غزل بھی ان اثرات سے متاثر ہوئی ان تمام حالات عکس اس دَور کی غزل میں نظر آتا ہے۔ خاص کر اکبر، چکبست اور اقبال کی غزلیں ان تبدیلیوں کا پرتو ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں[۱]:-

"ان کا تمام حالات کا عکس اس دَور کی غزل میں نظر آتا ہے اور اس تبدیلی کے مختلف پہلوؤں کے اثرات اکبر، چکبست اور اقبال کی غزلوں میں سب سے

---

[۱] "غزل اور مطالعۂ غزل" از عبادت بریلوی صفحہ ۲۷۰ ناشر انجمن ترقی اُردو پاکستان ستمبر ۱۹۵۵ء

زیادہ نمایاں ہیں۔ اکبر نے اپنے کو بہت زیادہ نہیں بدلا ہے۔ وہ سرسید کے
وقت ہی سے قدامت اور جدت۔ کفر اور ایمان کی الجھنوں میں پھنس گئے
تھے۔ ان کے یہاں سیاسی شعور کم ہے۔ البتہ معاشرتی اور اخلاقی پہلوؤں
کی طرف وہ خاص طور پر متوجہ ہوتے ہیں۔ چکبست کے یہاں قومی۔ وطنی
اور سیاسی شعور بڑا گہرا ہے وہ اس سے ہٹ کر کوئی بات نہیں سوچتے۔
اقبال پر ملکی اور ملی مسائل کا بڑا گہرا اثر ہے اسلئے ان مسائل کے مختلف
پہلوؤں پر غور کرنا ان کی زندگی کا نصب العین ہے وہ اسی میں ڈوبے
ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزلوں میں بھی ان مسائل کو سمویا ہے۔
حالی نے اس روایت کی بنیاد رکھی تھی۔ ان شعرا نے ان روایات کی بنیاد
کو استوار کیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ بیسویں صدی میں غزل
جن جدتوں سے آشنا ہوتی ہے اس میں اکبر۔ چکبست اور اقبال کا بڑا ہاتھ
رہا ہے۔ ان تینوں نے اس میں نئے موضوعات کو سمو کر اس کے دائرے کو
وسیع کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے اس میں نئے انداز بھی پیدا
ہوئے۔ اظہار اور طرز ادا کی نئی روایات بھی قائم ہوئیں۔ اس طرح اس
میں ہر اعتبار سے جدت کا رنگ ایک رچی ہوئی صورت میں نمایاں ہوا"

جس تفصیل کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کی نمائندگی حالی کے وقت سے مختلف شعرا کے
یہاں ہوتی رہی مثلاً اسمٰعیل میرٹھی۔ وحید الدین سلیم پانی پتی اور پنڈت برج نرائن
چکبست ان میں سے ہر ایک کی غزلیں غزلگوئی کے نئے امکانات کا پتا دیتی ہیں اور یہ
اندازہ ہونے لگتا ہے کہ غزل محض "بازنان حرف گفتن" سے آگے بھی بڑھ سکتی ہے
یہی نہیں کہ وہ عشقیہ مضامین کو نئے احساس کے ساتھ بیان کرے بلکہ قومی زندگی
کے بدلتے ہوئے مزاج کا بھی ساتھ دے سکتی ہے۔ اس کی بہت اچھی نمائندگی چکبست
کی غزلگوئی سے ہوتی ہے۔

چکبست کے عہد میں غزلگوئی اپنی پستی کے باوجود بڑی عام اور ہر دلعزیز
صنف سخن تھی۔ اس لئے چکبست بھی فطری طور سے غزل کا مذاق رکھتے تھے۔ انکے مضامین
کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو غزل گویوں کو بڑی گہری نظر سے پڑھا

تھا اور اپنے عہد کے بدلتے ہوئے احساس سے واقف تھے۔ اسلئے انھیں اس بات کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی کہ وہ غزل کو کس طرف لے جائیں۔ داغ کی شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے شاعری کی معیار پر بھی بحث کی ہے۔ اس موقع پر لکھتے ہیں :-

"داغ کا پایہ اُردو شعرا کے دربار میں کیا ہے اور اس کا کلام کس قسم کی تاثیر دل میں پیدا کرتا ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ معیار کیا ہے جس سے شاعرانہ وقار کے مختلف مدارج کا اندازہ ممکن ہوسکتا ہے یہ معیار اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب کہ شاعری کے اصلی مفہوم سے واقفیت ہو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ شاعری کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اس کے جذبات دلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عام تصویر پیدا کر دیتے ہیں اور چونکہ شاعر کی کانوں کی فضا میں سلاست زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی کے ساتھ ترتیب دیتا ہے کہ انمیں علاوہ عالم تصویر کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کے اُن احساسات اور خیالات کا عکس نظر آتا ہے جو اس کے جذبات دلی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اس کی زبان سے نکلتے ہیں۔ غرض کہ جذبات کی روح رواں ہیں اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہے لہٰذا جس قسم کے جذبات کے رنگ میں شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہوگا وہ اسی قسم کے جذبات سامع کے دل کو بھی جوش میں لائے گا۔"[1]

غزل کے متعلق یہ خیالات بہت واضح ہیں اور ان کی روشنی میں چکبست کے کلام کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

چکبست کی زندگی صرف ایک شاعر یا وکیل کی زندگی نہ تھی بلکہ انھوں نے سیاست

---

[1] مضامین چکبست۔ صفحہ نمبر ۶۸ از برج نرائن چکبست۔ طبع دوم ۱۹۳۶ء

اور سماجی اصلاحات اور تبدیلیوں میں خود حصّہ لیا اور ان پر باقاعدہ غور کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی غزلیں ان اثرات سے پُر ہیں مثال کے طور پر ۱۹۱۷ء کی ایک غزل ہے

فنا نہیں ہے محبت کی رنگ و بو کے لئے
بہارِ عالم فانی رہے رہے نہ رہے

جنونِ حبِ وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی
یہ مشت خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے
زباں کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے

مٹا رہا ہے زمانہ وطن کے مندر کو
یہ مرمٹوں کی نشانی رہے رہے نہ رہے

دلوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے
یہ جمع خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے

جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کے لئے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

ایک اور غزل کے چند شعر حسب ذیل ہیں ؎

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

خوشنوائی کا سبق میں نے قفس میں سیکھا
کیا کہوں اور سلامت مرا صیّاد رہے

باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کیلئے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیّاد رہے

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

حکم مالی کا یہ ہے بھول نہ ہنسنے پائیں
چُپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

باغ میں لیکے جنم ہم نے اسیری جھیلی
ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد رہے

دم سے گاندھی کے رہے شورِ وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے کوہ پہ فرہاد رہے

اس کے علاوہ اب بعض غزلوں میں سے چند شعر اور پیش کئے جاتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ وہ ایسے مضامین برابر نظم کرتے ہیں ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی ... پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں
غرور جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا ... بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

کمال بزدلی ہے خوار ہونا اپنی آنکھوں میں ... اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائیگی دل کی ... نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اس طرح کی غزلوں میں ان کے یہاں اور کوئی موضوع علاوہ سیاسی اور سماجی مسائل کے نہیں ملتا ہے۔ چکبست نے یہ تمام احساسات قبول کئے ہیں اس وجہ سے یہ تمام خیالات ان کے یہاں داخلی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دل کی کسک بن بن کر نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کا دل وطن کی محبت اور حب قومی سے سرشار تھا اور یہ سب خیالات اُن ہی احساسات کا آئینہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غزل میں وہی روائتی اشارے اور کنائے بھی ان خیالات کے ساتھ ملتے ہیں دراصل یہ چیز اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اور اسی نے عبادت بریلوی کو یہ لکھنے پر مجبور کیا[1]

"ان مسائل کی ترجمانی میں جو رچی ہوئی کیفیت چکبست نے پیدا کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ خالص سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی میں ایسی رچی ہوئی کیفیت جدید غزل میں چکبست کے علاوہ کوئی اور پیدا نہ کر سکا۔ اس اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔"

چکبست کی شاعری اور آج کے زمانہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ زمانہ ہوم رول کا زمانہ تھا۔ اس وقت آزادی کا تصور اس قدر واضح اور صاف نہ تھا۔ ان کی آزادی کی مانگ تو صرف ملکی معاملات کی آزادی کی مانگ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد کو پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑ چکی تھی اکثر مسلمان کانگریس سے الگ ہو کر مسلم لیگ کے ممبر

---

[1] غزل اور مطالعہ غزل از عبادت بریلوی صفحہ ۴۷۵ ناشر انجمن ترقی اُردو پاکستان ستمبر ۱۹۵۵ء

ہوتے جاتے تھے۔ لیکن ان تمام چیزوں اور ہر طرح کے خیالات والوں کے دلوں میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ بس ایک تھا۔ اور وہ جذبہ تھا وطن کی محبّت۔ چکبست خود اس جذبہ سے سرشار اور مست تھے جس نے ان کے حساس دل کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو ان کی خامیوں سے آگاہ کریں عبادت بریلوی اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں[۵]۔

"چکبست اس تحریک سے بہت متاثر تھے اس لئے ان کی غزلوں میں انھیں تمام باتوں کی ترجمانی ملتی ہے۔ چکبست اپنی غزلوں میں انگریزوں کی غلامی کا رونا بھی روتے ہیں۔ آزادی کے جذبہ کو بھی ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظلم و استبداد پر احتجاج بھی کرتے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ ایثار اور قربانی کے خیال کو بھی عام کرتے ہیں وطن کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بھی بہاتے ہیں۔ غرض یہ کہ چکبست کی غزلوں میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کا شعور اس زمانے کے حساس اور باشعور افراد میں موجود تھا۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں ان تمام رجحانات کی ترجمانی کی ہے جو اس زمانہ میں عام تھے"۔

چکبست کی غزلوں کے پیچھے اس زمانہ کی انقلابی کیفیت کی مکمل تصویر نظر آتی ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض اوقات اشعار میں ایک تسلسل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو غزل کی روایات اور اشارے اس میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں اور یہی چیزیں ان کی غزلوں کو نظم نہیں ہونے دیتی ہیں۔

حسن و عشق کی چاشنی سے تو غزل بالکل مبرّا نہیں کی جاسکتی ہے چکبست پرانے رنگ سے بہت کچھ الگ ہیں جیسا کہ خود انھوں نے سری رام صاحب کو لکھا ہے[۶]:-

"پرانے رنگ کی شاعری یعنی غزل گوئی سے ناآشنا ہوں لیکن اسی کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ مروڑ کر نظم کر دینا شاعری

---

[۵] غزل اور مطالعہ غزل۔ از عبادت بریلوی۔ صفحہ ۴۷۷ ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان ستمبر ۱۹۵۵ء

[۶] تذکرۂ ہزار داستان المعروف خمخانۂ جاوید جلد دوم از سری رام صفحہ ۳۲۹ مطبع گلاب سنگھ پریس لاہور ۱۹۱۱ء

نہیں ہے ۔میرے خیال کے مطابق خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے لیکن میں پھر آپ کو لکھتا ہوں کہ میں قدردانِ سخن ہوں سخنور نہیں ہوں جس کا نام شاعری ہے وہ اور چیز ہے جو بہر حال مجھے نصیب نہیں۔"

لیکن اس کے باوجود حسن کا تذکرہ ان کی غزلوں میں کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے۔ وہ نئے انداز کی غزلیں بھی لکھتے ہیں اور ساتھ ہی اخلاقی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی غزل میں بے ثباتی دنیا۔ نیرنگی زمانہ۔ بے وفائی احباب۔ کبر و نخوت زہد و اتقا کی برائی۔ عالم غربت میں وطن کی یاد۔ دیر و حرم۔ بت خانہ و کعبہ کے مضامین ملتے ہیں۔

شروع میں ان کے تغزل کا رنگ مبہم سا تھا لیکن جلد ہی اس میں ایک پختگی پیدا ہو گئی اب ان کے خیالات جامع اور وسیع تھے مثلاً ؎

اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا	فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اندھیری رات میں موتی لٹا جاتی ہے گلشن میں	نہیں ہوتا ہے محتاج نمائش فیض شبنم کا

جلد ہی ان کا انداز بیان اور خیالات پختہ سے پختہ تر ہو جاتے ہیں ؎

ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے	انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
مگر یقیں ترے وعدہ پہ لا نہیں سکتا	جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں

دنیا کی ہر زبان کے شاعروں نے فلسفہ کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ حیات اور موت کا فلسفہ اردو شاعروں کا خاص موضوع رہا ہے چکبست نے بھی اس کو ایک خاص انداز سے پیش کیا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

دنیا کے شاعروں نے مختلف طریقہ پر اس کو پیش کیا لیکن شاید اس قدر صاف اور واضح طور پر کسی نے نہیں پیش کیا۔ چکبست نے فلسفہ موت و حیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسی وجہ سے اس صفائی اور آسانی سے انھوں نے اس کو بیان کیا ہے کہ اس طرح کی مثال دوسرے شاعر کے یہاں ملنا آسان نہیں۔ ایک شعر کو دیکھیے ؎

عروسِ جاں نیا پیراہن ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

یہ ہیں زندگی کے وہ مسائل جن سے انسان روز دوچار ہوتا رہتا ہے لیکن اس کا دماغ کبھی اس طرف نہیں جاتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہیئے دوچار اشعار اور دیکھئے تو بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ چکبست کو اس مضمون پر کیسا عبور تھا ؎

اگر کون و مکاں اک شعبدہ ہے تیری قدرت کا
تو اس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا

جام تک ختم سے شراب آنے میں ساقی اتنی دیر
ہم تو بس تیرے تکلف سے پریشاں ہو گئے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

انسان زندگی میں مختلف قسم کی مصیبتوں پر مصیبتیں برداشت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کو زندگی سے ایک خاص قسم کا لگاؤ باقی رہتا ہے۔ اور یہی لگاؤ اس کو دنیا سے محبّت پیدا کراتا ہے ذرا غور کیجئے چکبست اس خیال کو کس کس انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آساں اس جینے سے مر جانا

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشتِ خاک کو غم دو جہاں کا ہے

رہ کے دنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سایہ سے گریزاں ہونا

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

یہ ہے دنیا کا حال جس کو چکبست کی بالغ النظری نے مکمل طور پر سمجھ کر شعر کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اب ذرا زندگی کی بے ثباتی پر غور کیجئے چکبست نے اس مضمون کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔

چمن کو دیدۂ عبرت سے دیکھ اے بلبل
گلوں سے پھوٹ کے رنگِ خزاں نکل آیا

بعد فنا فضول ہے نام و نشاں کی فکر
جب ہم نہیں رہے تو ہمارا مزار کیا

وہ برابر سمجھاتے ہیں کہ انسان کو موت ایک دن آنا ہے اس لئے اس کا خیال بہر رکھنا چاہیئے۔ چکبست کے نزدیک موت کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ وہاں صرف وقت کا رونا نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

ذرا غور کیجئے لفظ "فقط" پر اور گھر کو ویران کر کے قبر کے آباد کرنے پر تو شعر کا پورا لطف حاصل ہوگا اور یہ معلوم ہوگا کہ مرنا تو ایک معمولی بات تھی۔

چکبست کا کلام مبالغہ اور تصنع سے پاک وصاف ہے۔ ان کی طبیعت میں تصنع نہ تھا اس کے علاوہ انھوں نے آتش اور غالب کے کلام کو اپنا رہبر بنایا تھا جس کے متعلق حیدر مہدی ماہنامہ آزاد میں تحریر فرماتے ہیں[۵۱]:۔

"چکبست کو تصنع سے سروکار نہ تھا۔ اسلئے انھوں نے آتش و غالب کے کلام کو اپنی غزلوں کا نمونہ بنایا۔ چکبست کے کلام میں وہی صداقت شعارانہ انداز ہے جو آتش کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ وہی سوز و گداز لطافت اور شیرینی بھی موجود ہے۔ لیکن فلسفہ حیات کا جب وہ نقشہ پیش کرتے ہیں۔ زیست موت پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غالب کی آواز آرہی ہے۔ اپنی غزلوں میں آتش اور غالب کے کلام کی آمیزش سے چکبست نے اپنا ایک انفرادی رنگ پیدا کر لیا ہے۔ ان کی غزلیں داخلی جذبات کا اظہار ہوتے ہوئے خارجی کیفیات کی ایک عام حقیقت ہیں۔

وہ سر سے پیر تک قومی اور دیسی ہیں۔ خیالات۔ جذبات۔ زبان استعارات تشبیہات و تلمیحات سب مقامی اور ملکی ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے چکبست کو غزل گوئی میں اولین تاثرات آتش اور غالب سے حاصل ہوئے ذیل کے اشعار اس حقیقت کا ثبوت ہیں ؎

ہم سوچتے ہیں رات میں تاروں کو دیکھکر
شمعیں یں کی ہیں جو داغ آسماں کے ہیں

صحنِ چمن سے دور انھیں باغباں نہ پھینک
تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں

جنت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبتِ پیرِ مغاں کے ہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشتِ خاک کو غم دو جہاں کے ہیں"

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب اپنی کتاب مختصر تاریخ اردو میں تحریر فرماتے ہیں[۵۲]۔

"چکبست بچپن ہی سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ اساتذہ اردو کے کلام

---

[۵۱] ماہنامہ آزاد اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۹ء شائع صفحہ ۹۳

[۵۲] مختصر تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۱۹۹ بار دوم۔ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۲۰ء

کا بغور مطالعہ گویا ان کی روحانی غذا تھی جس نے ان کے جذبات پر صیقل کردی تھی۔ آتش۔ غالب۔ اور انیس نے اپنی لاتعداد خوبیوں سے انھیں اپنا گرویدہ بنالیا تھا جس کا اثر آج بھی ان کے کلام سے صاف نظر آرہا ہے۔ مسدس میں انیس کا اور غزل میں آتش کا انداز بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔

حکبست کے یہاں فلسفیانہ خیالات بہت کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں بہت خوب ہیں ایسے موقعوں پر وہ غالب کی تقلید کرتے ہیں، لیکن ظلم ہوگا اگر ان کی ذاتی ذہانت و سخنوری کی داد نہ دی جائے اور محض تقلید ہی تک ان کی فکر رسا کو محدود کر دیا جائے"۔

جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نے یوم چکبست میں جو مضمون پڑھا تھا اس میں بھی انھوں نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے تھے فرماتے ہیں[۱]:۔

"چکبست نے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے جن میں غالب آتش اور سب سے زیادہ گہرا انیس کا رنگ نمایاں ہے زبان کی سادگی اور صفائی۔ روزمرہ کا استعمال۔ بندش الفاظ اور کلام میں کہیں قناعت و استغنا کی شان آتش کی یاد دلاتی ہے"۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اپنے مضمون میں جو انھوں نے یوم چکبست میں پڑھا تھا اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں[۲]:۔

"اگر آتش اور انیس نہ ہوتے تو چکبست کا فروغ مشتبہ تھا۔ کیونکہ چکبست کی شاعری میں ان کی خداداد صلاحیت۔ ماحول اور اس کے پیدا کئے ہوئے تخیلات کو جس نے ایسی زبان بخشی جو تاثیر کا طلسم اور سوز و گداز کے ساتھ ساتھ شیرینی اور سلاست اور جوش و خروش کا دلکش مجموعہ ہے وہ لکھنؤ میں تربیت پانے کا فیض اور انھیں بزرگوں کے کلام کا گہرا مطالعہ ہے"۔

چکبست نے اکثر طویل غزلیں بھی لکھی ہیں لیکن جو خصوصیات ان کی مختصر غزلوں

---

[۱] چکبست کی شاعری۔ از یادگار چکبست صفحہ ۸۷ پبلشر انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۹ء۔
[۲] چکبست کی شاعری از یادگار چکبست صفحہ ۲۹ " " " "

میں ہیں وہی ان کی طویل غزلوں کی شان ہیں۔ اکثر غزلوں میں واقعات بیان کئے ہیں۔ ایک سب سے بڑی اور اہم خصوصیت ان کے سارے کلام میں یہ ملے گی کہ کسی ایک جگہ پر بھی انھوں نے کوئی رکیک جذبہ پیش نہیں کیا ہے۔ ان کا سارا کلام شرافت اور انسانیت کا مرقع ہے۔ انھوں نے غزلوں میں کہیں بھی الجھاؤ پیدا نہیں کیا بلکہ صاف اور سیدھے طریقہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی نے اپنے مضمون "چکبست کے کلام پر ایک سرسری نظر" جو انھوں نے یوم چکبست میں پڑھا تھا، فرماتے ہیں[۵۱]:-

"۔ ابھی نیا جوش عشق کا ہے صلاح سنتے نہیں کسی کی
کریں گے آخر میں پھر وہی ہم جو چارہ یار آشنا کریں گے

اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر خیالات کی سادگی اور واردات قلب کی بے ساختہ تصویر چونکہ کھینچی گئی ہے اس لئے پیش کرنے کے قابل ہے۔ روزمرہ کا ذکر فضول وہ اس کے مالک تھے۔"

جناب پنڈت امرناتھ زتشی ساحر چکبست کی شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے تحریر کرتے ہیں[۵۲]:-

"چکبست کی شاعرانہ نگاہ کس قدر تیز ہے جو خیالی پیچیدگیوں میں الجھاؤ پیدا نہیں کرتی بلکہ صاف نکل آتی ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں خیالات بلند۔ لیکن کچھ اس طرح سے شاعری کے نگینے جڑے گئے ہیں کہ فوراً دل میں اتر جاتے ہیں اور واہ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ خیالات فلسفیانہ ہیں۔ لیکن ژولیدگی سے عاری۔"

مناسب ہوگا اگر چند مثالیں سادگی کی پیش کر دی جائیں :-

جہاں میں آنکھ کھولی فنا کو بھول گئے — کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے
پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوئے — شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا
در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے — وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

---

۵۱ یادگار چکبست صفحہ ۱۲۴ پبلشر انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۹ء
۵۲ ماہنامہ بہار کشمیر لاہور۔ چکبست نمبر۔ فروری ۱۹۳۹ء صفحہ ۹۱

چکبست کا کلام مضمون آفرینی اور نزاکت تخیل سے بھی خالی نہیں۔ وسیع النظر ہونے کی بدولت وہ ہر چیز پر ایک گہری نظر ڈالنے پر مجبور ہیں۔ وہ روز کی معمولی باتوں پر بھی اس حد تک غور کرتے ہیں جہاں دوسرے کی نظر نہیں جاتی ہے مثلاً ؎

سبزۂ باغ سے کہتی ہیں یہ شاخیں جھک کر	سر اٹھانے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں

غور کیجئے ہر انسان دیکھتا ہے کہ پیڑوں کی شاخیں جھکی ہوتی ہیں لیکن شاید کسی نے بھی اس طرح سے غور کرنے کی کوشش کبھی نہ کی ہوگی۔ شبنم کے مضمون کو اردو شاعروں نے عام طور پر باندھا ہے لیکن چکبست نے اس میں ایک نئی شان پیدا کر دی ہے۔ کہتے ہیں ؎

صبح کو شبنم کے موتی باغ میں چوری گئے	پھول کرنوں سے یہ کہتے ہیں تمھارا کام ہے

چند شعر مثال کے طور پر اور پیش کئے جاتے ہیں ؎

گلشن سے نہ خوش جائے گا شبنم کا مسافر	ہنس ہنس کے رلانیکی ہے عادت گل تر میں

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر	ہزاروں پیرہن پیدا کرینگی دھجیاں میری

اک ہستیٔ بیدار کے دونوں ہیں کرشمے	موجوں میں روانی ہے جوانی ہے بشر میں

غزل میں سب سے اہم چیز زبان ہے جو غزل کو دیگر اصناف سخن سے الگ کرتی ہے چکبست کی تمام غزلیں دیکھ ڈالئے کہیں خیالات گنجلک نہ ملیں گے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال بھی ان کو پسند نہ تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کی زبان ان خامیوں سے پاک اور صاف ہے۔ انھوں نے تشبیہات اور استعارات کا برابر استعمال کیا ہے لیکن ایک انداز خاص سے ان کو استعمال کر کے ان کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ وہ خود تشبیہ اور استعارے کے استعمال سے جو شعر میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ داغ کی شاعری پر وہ بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں[1]:-

"شاعری جوہروں میں استعارہ اور تشبیہ کا پایہ بہت بلند ہے۔ استعارہ اور تشبیہ کی پختگی سے کلام کی تاثیر ہی نہیں بڑھ جاتی بلکہ شاعر

---

[1] مضامین چکبست۔ از برج نرائن چکبست۔ طبع دوم ۱۹۴۶ء صفحہ ۷۹

کی نازک خیالی اور باریک بینی کا بھی پتا چلتا ہے۔ جن دو اشیاء میں بادی النظر میں کوئی مشابہت نظر نہیں آتی شاعر ان کا پرتو اپنے آئینۂ خیال میں دیکھتا ہے اور اس کی باریک بیں نگاہ کو ان اشیاء میں معنوی حیثیت سے ایک مناسبت نظر آتی ہے وہ اس کیفیت کی تصویر الفاظ میں کھینچ دیتا ہے۔ اسی کا نام تشبیہ و استعارہ ہے۔"

چکبست نے تشبیہ و استعارہ کی تعریف بھی اس جگہ پر کر دی جس سے تشبیہ اور استعارہ کے فوائد صاف ہو جاتے ہیں۔ اب چند شعر دیکھئے ؎

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آبِ جوئے گلشن پر

پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوئے
شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا

پھیلی ہو جیسے گورِ غریباں میں چاندنی
عالم ہے یہ خوشی میں دلِ داغدار کا

ان اشعار میں محض روزمرّہ کی باتیں ہیں جن کو استعارہ اور تشبیہ کی شکل میں پیش کر کے اس کے حسن کو بلند کیا گیا ہے۔ چونکہ زبان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے فارسی اور اردو زبان دونوں میں ان کی معلومات جامع اور وسیع ہیں۔ محاورات کی معلومات بھی مکمل ہیں اس وجہ سے طرزِ بیان انتہا درجہ دلآویز ہے اور محاورات کا استعمال جچا تلا ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

مردِ قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس
پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں

ایک شعر اور دیکھئے طرزِ بیان کی بہترین مثال کہی جا سکتی ہے ؎

تیرے دل میں اور میرے دل میں ہے واعظ یہ فرق
وہ چراغِ صبح ہے اور یہ چراغِ شام ہے

ایک شعر میں واقعہ فرہاد و قیس کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

قصّے لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد قیس کے
کھوئے ہوئے ورق وہ میری داستاں کے ہیں

رام بابو سکسینہ چکبست کی غزل گوئی کے متعلق فرماتے ہیں[۱] :-

"بحیثیت غزل گو چکبست پرانے رنگ سے بالکل علیحدہ رہنا چاہتے تھے انھوں نے صنف غزل میں ایک خاص جدت اور ترقی کی اور قدیم طریقہ سے علیحدہ رہے پرانے فرسودہ تشبیہات، واستعارات اور لوازمات غزلگوئی کو یک قلم خارج کردیا اور شیرینی اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا اور یہی چیز ان کے کلام مابہ الامتیاز جوہر ہیں۔ ان کے مجموعہ نظم میں بمشکل پچاس غزلیں نکلیں گی۔ اور ان میں بھی اکثر ناتمام معلوم ہوتی ہیں، مگر ان میں انھوں نے اپنی سحر نگاری اور جادو نگاری کا پورا کرشمہ دکھا دیا ہے۔ کہیں کہیں فلسفہ اور اخلاق اور نصیحت آمیز شعر بھی خوب کہے ہیں۔ انکے اکثر اشعار ضرب المثل کے سکہ شاہی میں بقا و دوام کے مستحق ہیں۔"

انھوں نے جیسا رام بابو سکسینہ فرماتے ہیں پرانے فرسودہ طریقہ کو تبدیل کرنا چاہا ہے خود بھی ایک جگہ کہتے ہیں ؎

عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں | نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں

چکبست نے غزل کو وسعت دی اور نئی نئی اصلاحوں کے ساتھ باعتبار مضمون اس میں بے حد وسعت پیدا کردی۔ ہر ہر چیز میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ تشبیہات اور استعارات کو بھی کچھ اس ڈھنگ سے پیش کیا کہ نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور یہی چیز ان کو اور شعراء سے ممتاز جگہ بٹھاتی ہے۔ غزل کہنے میں نئے مضامین داخل کئے لیکن انھیں پرانے طرز پر پیش کیا جس سے عوام روشناس تھے۔ اس وجہ سے ان کی غزلوں کا اثر خوب ہوا۔ مختصر یہ کہ الفاظ کی بندش۔ ترکیبوں کی چستی۔ بیان کی سلاست اور روانی ان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی قادرالکلامی۔ الفاظ کے خوش سلیقہ انتخاب سے ٹپکتی ہے۔ الفاظ میں توازن اور ترنم ہوتا ہے۔ ان کا سارا کلام متانت اور بلاغت کا ذخیرہ ہے۔ الفاظ کے گورکھ دھندوں سے انھیں نفرت تھی اور

---

[۱] تاریخ ادب اردو۔ از رام بابو سکسینہ۔ مترجمہ مرزا محمد عسکری۔ مطبع منشی نولکشور پریس لکھنؤ دوسری بار صفحہ ۱۷۶ ضمیمہ

یہی وجہ ہے کہ سارا کلام سلاست اور صداقت سے پُر ہے دراصل چکبست پُرانے اور جدید دَور کو ملاتے ہیں جیسا کہ آل احمد صاحب سرور کا ارشاد ہے۔[۵]

"افسوس ہے کہ وہ نسل جس سے چکبست تعلق رکھتے تھے شمالی ہند سے اُٹھتی جاتی ہے اور اب اس کی جگہ لینے والے نظر نہیں آتے یہ وہ نسل تھی جو اپنی تہذیب و معاشرت اور اُردو ادب سے قلبی محبت رکھتے ہوئے ترقی پسند اور آزاد خیال بھی تھی۔ آپ حضرات اس کے معنی یہ نہ سمجھیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ لوگ قدیم اور جدید سلسلے کی درمیانی کڑی تھے اور دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتے تھے۔ بہت زیادہ سوچ نہ سکتے تھے۔ بہت اونچا اڑ نہ سکتے تھے۔ بہت دُور دیکھنا ان کے بس کا کام نہ تھا (کیونکہ تاریکی سے ابھی ابھی نکلے تھے) مگر ان کا دل فراخ ان کی طبیعت زیادہ سلجھی ہوئی اور ان کی محبت کے قانون زیادہ وسیع تھے اور بعض لوگ جب ان کی نارسائی پر اعتراض کرتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ کیسی کیسی مشکلات انھیں دامنگیر تھیں"

سرور صاحب نے ان مشکلات کو جن سے چکبست کو دوچار ہونا پڑا تھا واضح کر دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی غزلوں کا حجم ان کی نظموں کے مقابلہ میں کم ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ غزل کہنا پسند نہیں کرتے تھے یا کہہ نہ سکتے تھے۔ بلکہ ان کا جذبۂ وطن پرستی اور جذبۂ اصلاح ان کو نظم کی طرف زیادہ لے جاتا تھا۔ جہاں آزادی کے ساتھ انھوں نے اپنے خیالات کو پیش کیا۔ آتش کی آزادانہ روش پر چلنے اور ان کے رنگ سے بیحد متاثر ہونے کا اثر یہ ہوا کہ وہ جو بات کہتے ہیں آزادی کے ساتھ پوری قوت سے کہتے ہیں۔ آتش نے تصوّف کی گرمی سے اپنے کلام کو سوز و ساز عطا کیا تھا۔ چکبست نے تصوّف کے بجائے قوم پرستی اور حب الوطنی کو اپنے خیال میں مرکزی جگہ دی اور ان خیالات کو تغزل کے رنگ میں پیش کیا جو بظاہر نظم کے موضوع بن سکتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی غزلوں پر غزل کی عام تعریف صادق نہیں آتی یعنی وہ محبوب سے گفتگو کرنے تک محدود نہیں ہے لیکن ان میں جو اثر،

---

۵ تنقیدی اشارے آل احمد سرور ۱۹۴۹ء صفحہ ۱۱۲-۱۱۳

سوز و گداز اور کیف ہے، وہ غزل سے مالا مال ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وطن اور قوم ان کے محبوب ہیں جن کے ترانے وہ اپنی غزل میں گاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

وطن میں بے وطن مجھکو کیا ہے اک فسوں گر نے
نہ میں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
میرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

کشش وفا کی انھیں کھینچ لائی آخر کار
یہ تھا رقیب کو دعویٰ وہ آ نہیں سکتے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

خوشنوائی کا سبق میں نے قفس میں سیکھا
کیا کہوں اور سلامت میرا صیاد رہے

یہ بےکسی بھی عجب بےکسی ہے دنیا میں
کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

جنونِ حبِ وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہمکو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

لطف شاہی کی تمنا غیر کے دل میں رہے
ہم فقیروں ہی سے زندہ لکھنؤ کا نام ہے

وہ دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کیلئے ممکن نہیں زنداں ہونا

خالص تغزل کے اشعار کی بھی کمی نہیں مثال کیلئے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

مٹانا تھا اسے بھی جذبۂ شوقِ فنا تجھ کو
نشانِ قبرِ مجنوں داغ ہے صحرا کے دامن پر

کہا غنچہ نے ہنس کر واہ کیا نیرنگِ عالم ہے
وجودِ گل جسے سمجھے ہیں سب ہے وہ عدم میرا

بے حجاب آج تیری نرگس مستانہ ہے
اب جسے ہوش کا سودا ہے وہ دیوانہ ہے

آتشِ شمع بھی کافور ہے اس کے آگے
دل میں جو آگ چھپائے ہوئے پروانہ ہے

صبح کو شبنم کے موتی باغ میں چوری گئے
پھول کرنوں سے یہ کہتے ہیں تمہارا کام ہے

کیوں رلانے کو سناتے ہو وفا کے قصے
دوستو اب تو محبت کا یہ دستور نہیں

قید یوسف کو زلیخا نے کیا کچھ نہ کیا
دل یوسف کے لئے شرط تھا زنداں ہونا

چکبست نے اظہار خیال کے لئے جو شاعرانہ سانچے استعمال کئے ان میں نوحہ اور مرثیہ کو بھی اہمیت حاصل تھی کیونکہ وہ زندگی کے جن جذباتی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے تھے اس میں کسی عزیز یا عزیز قوم کا جدا ہو جانا گہری جذباتی کیفیت رکھتا تھا اس لئے ان کے بہت سے ذاتی اور قومی خیالات اس شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ قومی رہنماؤں کے مرثیوں کو سیاسی نظموں میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ انھیں صبح وطن میں نوحہ جات کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے اس لئے ان پر علٰحدہ نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

چکبست کے وقت میں اور آج بھی مرثیے کا لفظ عام طور سے واقعات کربلا سے متعلق نظموں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن چکبست کے مرثیے واقعہ کربلا نہیں بلکہ ان متعدد لوگوں کی وفات کے تاثرات ہیں۔ جن کے انتقال سے انھیں دلی صدمہ ہوا ہے۔ یہ نوحے مسدس کی شکل میں ضرور ہیں۔ شائد اس کی وجہ انیس مرحوم کا غیر معمولی اثر اور وہ آسانی ہے جو چھ مصرعوں میں کسی مضمون کے بیان کرنے سے ہو جاتی ہے۔ ان کے سب مرثیے مختصر نظمیں ہیں جن میں ان کے ذاتی تاثرات کا ذکر ایسے دردناک طریقہ پر کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا ان کے غم میں شریک ہو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مرثیے کے بجائے ان نظموں کو نوحہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ ان میں وہ بھرپور اظہار غم نہیں ہے جو مرثیے میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً میں مرنے والوں کی پوری تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ بلکہ ان کے خیالات چند تاثرات کے بیان تک محدود رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چکبست نے خود انھیں نوحہ کہا ہے۔ اس لئے انھیں مرثیوں کی کسوٹی پر پرکھنا درست نہیں ہوگا جو واقعات کربلا کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔

انھوں نے کل نوؔ نوحے لکھے ہیں جو تین حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل وہ نوحے جو عزیزوں اور دوستوں کے مرنے پر لکھے ہیں ان میں "اقبال نرائن مسئلہ دان"۔ "ایک جواں مرگ دوست" نشتر یا س اور ماتم یاس آتے ہیں دوم ان حضرات کے مرثیے جو قومی لیڈر کی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کے دوست یار رہبر تھے۔ ان میں دو مرثیے آتے ہیں "بشن نرائن در" اور "گنگا پرشاد ورما" اور تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو صرف سیاسی رہبر تھے۔ ان میں تین حضرات کے نوحے آتے ہیں۔ گوپال کشن گوکھلے۔ بال گنگا دھر تلک۔ اور رانا ڈے۔

پہلی قسم کے نوحوں میں مرنے والے سے ذاتی تعلق کا بیان ہے۔ اس سے خود چکبست کو کیا لگاؤ تھا۔ مرنے والے نے جو جگہ خالی کی اس کا پُر ہونا ناممکن تھا مثلاً "ایک جواں مرگ دوست" کا نوحہ جو انھوں نے پنڈت پرتاپ کشن گرٹو صاحب کے انتقال پر لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں ؎

پھر رہی ہے دیدۂ مشتاق میں صورت تیری — کھیلتی رہتی تھی ہر دم تیرے ہونٹوں پر ہنسی
ہے ہمارے پردہ ہائے گوش میں ابتک بسی — گفتگو تیری جوانی کی اُمنگوں سے بھری
اب وہ لطف زندگی حاصل نہ ہوگا خواب میں
جانشیں تیرا کہاں ہے صحبتِ احباب میں

اب وہ ربط و ضبط وہ اگلی ملاقاتیں کہاں — وہ بگڑنا اب کہاں وہ میل کی باتیں کہاں
دل لگی کی ہر گھڑی ہر دم نئی گھاتیں کہاں — وہ زمانہ اب کہاں وہ دن کہاں راتیں کہاں
بے مزہ تیری مئے لطفِ جوانی ہوگئی
داستانِ عشق اپنی بھی کہانی ہوگئی

ساتھ کس کے ہوگی اب وقتِ سحر سیرِ چمن — گرم کس کی گفتگو سے ہوگی شب کی انجمن
خندہ پیشانی سے دیگا کون اب دادِ سخن — کون ہوگا موت پر مجھ خستہ جاں کی نوحہ زن
تو مرا ہمدرد سچا آشنا جاتا رہا
زندگی کا لطف مرنے کا مزا جاتا رہا

اپنے غم کا۔ جذبات کا۔ اظہار چکبست نے کیونکر کیا ہے۔ اور ایک عزیز "ہم درد آشنا" کی جدائی میں انھوں نے کس طرح سے خون کے آنسو بہائے

ہیں ان بندوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح "ماتم یاس" میں اپنے ایک عزیز پنڈت اجودھیا ناتھ آغا کی وفات پر اپنے ذاتی نقصان کا اظہار کرتے ہیں ؎

محفل احباب بے قائم ہے تو ہے مست خواب — کچھ خبر ہے آج کس کس کی ہوئی مٹی خراب
آخری تسلیم کے مشتاق ہیں کچھ دے جواب — پھر نظر آئے گی کا ہے کو یہ تصویر شباب

ہنس کے ہر اک بات پر وہ جنبش ابرو کہاں
اک نظر پھر دیکھ لے اب ہم کہاں اور تو کہاں

اپنے غم کے ساتھ ساتھ وہ مرنے والے کے عزیزوں اور دوستوں کے غم کو بھی نہایت پُردرد انداز میں بیان کرتے جاتے ہیں مثلاً "ایک جواں مرگ دوست" کے نوحہ میں گرٹو صاحب کی بیوہ کے غم کی اس طرح عکاسی کرتے ہیں ؎

کچھ خبر ہے تجھ کو اے دل دادۂ خواب فنا — ہے سر بالیں یہ کیا ہنگامۂ محشر بپا
نعرہ ہائے درد یہ کیسے ہیں یہ ماتم ہے کیا — چاک ہے کس کا گریباں کون ہے سر دھن رہا

ہے تڑپتا کون دل جینے سے کس کا سیر ہے
بال کس نے لاش پر کھولے یہ کیا اندھیر ہے

دیکھ تیری بیوۂ غمگیں پہ کیا افتاد ہے — محو حیرت یاس سے وہ کشتہ بیداد ہے
مہر خاموشی لبوں پر دل میں تیری یاد ہے — خانۂ ویراں کی صورت خاطر ناشاد ہے

خاک آلودہ مسرت ہائے پنہاں ہو گئیں
آرزو میں دل کی سب خواب پریشاں ہو گئیں

درد دل اس کا لب خاموش کہہ سکتا نہیں — اشک حسرت دیدۂ پُرنم سے بہہ سکتا نہیں
بند سینے میں مگر طوفان رہ سکتا نہیں — یہ وہ صدمہ ہے کہ دل انساں کا سہہ سکتا نہیں

محو حیرت ہم نشیں ہیں اس کی آہ سرد سے
سوزش پنہاں عیاں ہے اسکے رنگ زرد سے

یہ ایک ایسی بیوہ عورت کا حال ہے جو کمسن بھی ہے اور جس کی شادی کو زیادہ عرصہ بھی نہ گزرا تھا۔ ابھی اس نے شادی کے بعد زندگی کے لطف بھی نہ اٹھائے تھے کہ اس کا سہاگ لٹ گیا۔ ساتھ ہی دنیا کی شرم و حیا اس کو اتنے بڑے صدمہ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

اسی طرح سے جب وہ مرنے والے کی ماں کی کیفیت بیان کرتے ہیں تو اس کے بھی صحیح جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اسی مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

مادرِ ناشاد تیری وہ ازل کی سوگوار — پہلے ہی اسکی نگاہوں میں تھی دنیا تنگ و تار
تیرے دم سے تھا بندھا شیرازۂ صبر و قرار — ہائے اس بیکس کا اب بیڑا کریگا کون پار
آج اس کا مایۂ تاب و تواں جاتا رہا
ناخدائے کشتیٔ بے بادباں جاتا رہا

یہ ایک اس ماں کا حال ہے جو جوانی میں خود بیوہ ہو گئی تھی جس کی زندگی کا سہارا اس کی اولادیں تھیں۔ لیکن ان کا بڑا لڑکا جب پڑھ لکھ کر نوکر ہوتا ہے تو وہ ماں کی آنکھ کے سامنے دنیا سے اُٹھ جاتا ہے۔ ماں جس کی تمام اُمیدیں اس سے وابستہ تھیں اس کا یہ خیال تھا اسی طرح "ماتم یاس" میں ماں کا حال بیان کرتے ہیں ؎

صبح کا تارا بھی چمکا ہو گیا دن آشکار — تیرے چہرے سے مگر سرکی نہ چادر زینہار
دیکھ لے اُٹھ کر ذرا اپنی جوانی کی بہار — سن تو کیا کہتی ہے ماں شانہ ہلا کر بار بار
یہ کفن ہرگز نہیں تیرے پہنانے کے لئے
لائی ہوں خلعت تجھے دولھا بنانے کے لئے

چکبست اکثر اپنے عزیزوں کے نوحوں میں اس طرح کے اشارے کرتے جاتے ہیں جس سے عام پڑھنے والوں کو تو دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن ان عزیزوں کے لئے جس کو اس صدمہ سے دوچار ہونا پڑا ہے یہ اشارے ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

وہ اکثر مرنے والے کے دوستوں کی حالت اور جذبات کی منظر کشی بھی کرتے ہیں۔ "ماتم یاس" میں پنڈت اجودھیا ناتھ آغا مرحوم کے دوست شری نرائن مصرا جو کسی وقت میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے اور جنھوں نے اپنے دوست کی بے حد خدمت کی لیکن تقدیر کے لکھے کو نہ بدل سکے[1] ؎

تیری بالیں پر کھڑا ہے اور بھی اک سوگوار — وہ عزیزوں سے سوا تیرا انیس و غمگسار
چھوڑ کر گھر بار تجھ پر جان کی اپنی نثار — یہ محبت کا فسانہ بھی رہے گا یادگار

---

[1] بیان پنڈت برج کشن گرٹو

نالہ و فریاد اس کے زخم کا مرہم نہیں
چارۂ آنسو کا جو ہو محتاج یہ وہ غم نہیں

پنڈت اجودھیا ناتھ کو ٹیومر کی بیماری تھی جس سے شدید قسم کی بدبو آتی کوئی شخص زیادہ دیر ان کے پاس نہ بیٹھ سکتا۔ لیکن مصرا جی نے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر ان کی خدمت کی۔[1] چکبست نے ایک مونس ہمدم اور ساتھی کا ذکر کیا ہے جو (جس کی تمام محنت اور خدمت دوست کی زندگی کے واسطے تھی) آج اس قدر متاثر ہے کہ اس کی آنکھ کے آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔

ان عزیزوں یا دوستوں کے نوحوں کا جائزہ لینے سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ چکبست ان مرنے والوں سے کسی خاص وجہ سے متاثر ہوئے جس کا اظہار انھوں نے اپنے نوحوں میں کر دیا۔ اس سے ان کا مقصد دوستی کا حق بھی ادا ہو گیا اور دل کی بھڑاس بھی نکل گئی۔

دوسری طرح کے نوحے وہ ہیں جو ایک طرف تو قومی لیڈروں کے اٹھ جانے پر لکھے گئے ہیں لیکن دوسری طرف وہ انفرادی تاثرات بھی رکھتے ہیں۔ اس میں دو نوحے آتے ہیں۔ اول پنڈت بشن نرائن در اُبر یہ ہندوستان میں سیاسی رہنما و مفکر کی حیثیت رکھتے تھے۔ کانگریس کے صدر بھی رہ چکے تھے اور ان کا اثر عام ہندوستانیوں پر غیر معمولی تھا۔ دوسرے بابو گنگا پرشاد ورما جن کو لکھنؤ کی شہری زندگی میں خاص مقام حاصل تھا۔ ان دونوں حضرات سے چکبست کو جو خلوص و محبت تھی اس کا مکمل ذکر تو ان کی حیات والے باب میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں پر صرف ان تاثرات کو دیکھنے کی ضرورت ہے جن کی وجہ سے یہ نوحے لکھے گئے۔ ان دونوں مرثیوں میں ایک طرف تو قومی نقصان کا ذکر ہے، دوسری طرف ذاتی نقصان کا نوحہ "بشن نرائن در" کے لئے فرماتے ہیں ؎

صدمہ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا — بے زبانوں کی زباں دل کا سہارا نہ رہا
گلشن علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا — مطلع دانش و بینش کا ستارا نہ رہا

---

[1] پنڈت برج نرائن گرٹو

سب ہیں غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

ہم نے دیکھے ہیں ترے رشکِ محبت اکثر — جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر
دو نگینے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر — ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر

ظاہری حسن لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے — حسنِ اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے
جذبۂ خیر کی توقیر مٹی جاتی ہے — ہم مٹے جاتے ہیں تقدیر مٹی جاتی ہے

دلِ مایوس محبت کا عزاخانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دنیا نہیں ویرانہ ہے

غور کیجیے خلوص۔ محبت۔ انسانیت۔ حسن اخلاق۔ جذبہ خیر۔ کتنی نیکیوں اور بھلائیوں کا خون ایک در کے اٹھ جانے سے ہوجاتا ہے۔ کتنی چیزیں صرف ایک انسان کے نہ ہونے سے متاثر ہیں۔ چکبست کو جو عقیدت بشن نرائن سے ہے اس کا مکمل اظہار تو ان کی نظم "نذرانہ روح" سے ہو چکا ہے۔ یہاں پر ان کے مرنے کا غمناک منظر پیش کرنا مقصود تھا کیونکہ اس کی حیثیت ایک نوحے کی ہے۔ پنڈت بشن نرائن در سے چکبست کو جو عقیدت اور ارادت تھی اس کا جائزہ چکبست کے سوانح حیات میں لیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اس تعلق کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں بس اتنا سمجھنا چاہیئے کہ بشن نرائن در کی موت چکبست کے لئے صرف ایک دوست، ایک رہنما، ایک فلسفی کی موت نہیں تھی بلکہ یہ قومی نقصان بھی تھا۔ ان تمام حیثیتوں کو انھوں نے بڑی خوبی سے صرف چند بندوں میں سمو دیا ہے، چکبست خود نہایت سنجیدہ انسان تھے اس لئے وہ کھل کر نہ رو سکتے تھے اور نہ عام انسانوں کی طرح گریہ و بکا بلند کرنے کی ان سے امید ہو سکتی تھی۔ ان کے ہر نوحے میں اعتدال پسندی نمایاں ہے اور ہر جگہ انھوں نے غم پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے غم کو جذباتی رنگ سے پیش کرنے تک محدود نہیں رکھنا پسند کرتے بلکہ ان کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اس بات کی مکمل طور پر وضاحت کر دیں کہ کسی ایک انسان کے اٹھ جانے سے کیا کیا

اور کس کس طرح کے نقصانات ہو سکتے ہیں۔ یہ نقصانات خواہ ملک و قوم کے ہوں،
خواہ انفرادی ہوں چکبست ان کو پیش کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔

اسی قسم کا دوسرا نوحہ بابو گنگا پرشاد ورما کا ہے۔ ان کے اوصاف بیان
کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

بڑھ گئی شومئ قسمت کی سیاہی افسوس | آ گئی شہر کے بیڑے پہ تباہی افسوس
مٹ گئی عالمِ اخبار کی شاہی افسوس | اٹھ گیا قوم کے لشکر کا سپاہی افسوس

کون میدانِ سیاست میں کمر باندھے گا
قوم کے واسطے سینے پہ سپر باندھے گا

قوم کرتی تھی فقط تیری زباں سے فریاد | بحث و تحریک کے میداں میں قلم تھا آزاد
تیرے اخبار دلائیں گے ترے جوش کی یاد | دل کے ٹکڑے ہیں یہی اور یہی تیری اولاد

ہوں خبردار ترا عشق جتانے والے
ان یتیموں سے ترا نام چلانے والے

دولتِ علم و ہنر سے نہیں دنیا خالی | بزمِ عالم کی یہ رونق نہیں جانے والی
پر ہے کمیاب وہ جوہرِ وہ سرشت عالی | آدمیت کی بنا جس نے ازل میں ڈالی

کچھ بڑی بات نہیں فاضل دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

ان کے اوصاف اور قوم کے غم کو بیان کرنے کے بعد ان کی ماں کا بھی غم بیان
کرتے ہیں ؎

کچھ تجھے مادرِ ناشاد کا آیا نہ خیال | جوش طوفاں میں ہے کشتئ شکستہ پامال
تیرے ہی غم میں پریشاں ہیں وہ برف سے بال | دیکھ ہلتی ہے زمیں سن کے یہ دکھیا کا سوال

مدتوں یاد میں اپنی نہ رلانا ہرگز
میں بھی آتی ہوں مجھے بھول نہ جانا ہرگز

آگے چل کر پھر ایک بند میں فرماتے ہیں ؎

ہائے وہ دن کہ ترے گھر کا اجالا نہ رہا | ماں کا دنیا میں نشاں گود کا پالا نہ رہا

درد میں دکھ میں کوئی پوچھنے والا نہ رہا   زہر جینا ہوا امرت کا پیالا نہ رہا

ہے غنیمت کہ ابھی وطن سے دل ناشاد نہیں
قوم کے غم سے زیادہ غمِ اولاد نہیں

چکبست بڑے پُردرد الفاظ میں اس ماں کا حال بیان کرتے ہیں جس کے بڑھاپے کا تنہا سہارا ختم ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ماں کو اپنے بیٹے کا ذاتی غم ہوتے ہوئے بھی قوم کی حالت کی فکر ہے۔ کیونکہ گنگا پرشاد ورما ان لوگوں میں تھے جنھوں نے اپنی جان اپنی قوم پر قربان کی ہو ــــ دق کا مرض ہوتے ہوئے وہ اخبار اور سیاست میں دل و جان سے لگے رہتے۔ اس حالت میں ماں قوم کے غم کو اپنے غم پر ترجیح دیتی ہے۔

تیسری قسم ان نوحوں کی ہے۔ جو صرف سیاسی حضرات کی موت پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں گوپال کرشن گوکھلے۔ بال گنگا دھر تلک اور مہادیو گووند رانا ڈے آتے ہیں۔ مہادیو گووند رانا ڈے ایک عالم۔ مصلح قوم انسان تھے اس لئے ان کا نوحہ بھی اسی انداز سے شروع ہوتا ہے کہ ؎

اے آفتاب اوج عمارت کہاں ہے تو   اے شمع بزم حسن لیاقت کہاں ہے تو
اے عندلیب باغ فصاحت کہاں ہے تو   اے خضر شاہراہ فراست کہاں ہے تو

"اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ
باب تو خستہ ایم تو بے ما چگونہ"

ایک عالم بزرگ۔ مصلح قوم کی شخصیت ہر ہر لفظ سے نمایاں ہو رہی ہے۔ قوم مرہٹہ جس کے ایک فرد رانا ڈے تھے اسکے صدمے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

تیری تو روح گلشنِ جنّت میں ہے مقیم   احباب روتے ہیں تجھے باحالت سقیم
دل جانتا ہے ان کو جو ہے صدمۂ عظیم   مرنے سے تیرے قوم مرہٹہ ہوئی یتیم

قائم مکان عزت و اعزاز کب رہے
تجھ سا ستون عظم شوکت نہ جب رہے

آگے چل کر ان کی خدمات کو جو میدان علم و ادب میں تھے بیان کرتے ہیں ؎

میدانِ علم و فن میں عجب یکّہ تاز تھا   بس تجھ سے در ترقی قومی کا باز تھا

عالم میں سر بلند تھا اور سرفراز تھا　　اہلِ وطن کو تیری لیاقت پہ ناز تھا
زورِ قلم سے شاہی ملک بیاں ملی
بوسے نے جس کے نطق وہ پیاری زباں ملی

تحریرِ علم و فضل سے تیری تھی انتخاب　　اور سادگی و حسن لطافت میں لاجواب
تقریر میں وہ نورِ معانی کی آب و تاب　　ہر دم زباں تھی شہدِ فصاحت سے کامیاب
جب تنگ نفس کی تن سے روانی نہیں گئی
قبضے سے تیرے سیف بیانی نہیں گئی

آخر میں اس نوحے کے تین بند دیکھئے، ان کی حیثیت اہمیت اور ان کی جگہ کس طرح سے بیان کی گئی ہے ؎

اتنے میں گر ہوا سے وہ بجھ جائے ناگہاں　　حالت وہ اہلِ قافلہ کی ہو کہ الاماں
نظروں سے ہو گیا ہے ہماری جو تو نہاں　　احباب کا ترے وہی عالم ہے بے گماں
تو رہنمائے قوم تھا روشن دماغ تھا
اور اپنے بزم ملک کا چشم و چراغ تھا

بزمِ وطن میں یوں تو بہت گل ہوئے چراغ　　ویران سیکڑوں گل تر کھ گئے یہ باغ
لیکن یہ ہے محال کہ در صورتِ فراغ　　دل سے مٹے یہ مادرِ ہندستاں کے داغ
بہتر بھی ہے یہی کہ یہ ماتم بپا رہے
تا حشر دل میں زخمِ محبت ہرا رہے

کتبے ہوں سنگ و خشت کے کتنے ہی استوار　　ان کو مٹا ہی دیتا ہے نیرنگ روزگار
لیکن جو تیرے ملک پہ احساں ہیں بے شمار　　سب تیرے جوشِ حبِ وطن کے ہیں یادگار
تیری زبانِ حال سے مدحت کہیں گے یہ
تہذیب کا وجود ہے جب تک رہیں گے یہ

یہ نوحہ ایک اور حیثیت سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ چکبست کا پہلا نوحہ ہے۔ جو ۱۹۰۱ء میں تصنیف ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف انیس سال کی تھی۔ جوشِ حب قومی۔ سماجی اصلاح سے دلچسپی قومی رہبروں سے عقیدت جس طرح اس نوحہ میں نمایاں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن کس راستہ پر جا رہا تھا۔

اس قسم کے نوحوں میں دوسرا نوحہ گوکھلے کا ہے۔ گوکھلے نیک دل خاموش انسان تھے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ملکی انتظام میں بھی اِن کا خاص مقام تھا۔ ان سب چیزوں سے بڑھ کر وہ ملک و قوم کے ایسے رہبر تھے جس پر ہر فرقہ اور ہر خیال کے لوگوں کو بھروسہ اور اعتماد تھا۔ ان کا نوحہ جب لکھا جاتا ہے تو ان کی نیک سیرت اور نرم دل ہونے کی وجہ سے نرم الفاظ سے ان کو یاد کیا جاتا ہے۔ چکبست کہتے ہیں ؎

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے — وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے چل پھول اور پتھر سے — زمیں یہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
"زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا"

اب ان کی خدمات کے ذکر کو بھی سنئے ؎

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ — سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ — شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

وطن کی جاں پہ کیا کیا تباہیاں آئیں — اُمنڈ اُمنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں — دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں
اس انتشار میں جس نور کا سہارا ہے
افق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا ہے

حدیث قوم بنی تھی تری زباں کیلئے — زباں ملی تھی محبت کی داستاں کیلئے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کیلئے — کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کیلئے
وطن کی خاک تری بارگاہِ اعلیٰ ہے
ہمیں یہ ہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

اب ذرا اس غم کے منظر کو بھی دیکھئے جو ان کے اٹھ جانے سے پیدا ہو گیا ہے ؎

دلوں میں نقش ہیں اب تک تری زباں کے سخن — ہماری راہ میں گویا چراغ ہیں روشن
فقیر تھے جو ترے در کے خادمانِ وطن — انھیں نصیب کہاں ہوگا اب ترا دامن

ترے الم میں وہ اس طرح جان کھوتے ہیں
کہ باپ سے چھٹ کر یتیم روتے ہیں

اس قسم کا تیسرا نوحہ بال گنگا دھر تلک کا ہے۔ یہ کانگریس کے بائیں بازو کے رہنما تھے۔ ایک پُرجوش انسان ہونے کے ساتھ ہی انگریزوں کے خلاف ان میں ایک باغی کی رُوح موجود تھی۔ وہ قوت سے انگریزوں کو باہر نکال دینے کے قائل تھے۔ چکبست ان کے نوحے کو جیسے شروع کرتے ہیں پتا چلتا ہے کہ کسی ایسے شخص کا ذکر جو گوپال کرشن گوکھلے سے مختلف ہے ؎

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار
بے کسی چھائی ہے تقدیر بِگڑی جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

آگے بڑھ کر فرماتے ہیں ؎

تھا نگہبان وطن دبدبۂ عام ترا
نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا
یاد کرکے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا چین سے جب سوئیں گے

تلک کی سیرت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے ان کے جذبہ حب وطنی کو جس طرح سے نمایاں کرتے ہیں وہ بھی اہم ہے۔

زندگی تیری بہارِ چمنستانِ وفا
آبرو تیرے لئے قوم سے پیمانِ وفا
عاشقِ نام وطن کشتۂ ارمانِ وفا
مرد میدانِ وفا جسم وفا جانِ وفا
ہوگئی نذرِ وطن ہستیٔ فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

یہ تو تلک کے نوحے کے چند بند ہیں جن میں درد و غم کا اظہار کیا گیا ہے لیکن جب ہم ان کے رسالے صبح امید کے اڈیٹوریل پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں تلک کے سیاسی خیالات سے سخت اختلاف تھا لیکن چونکہ ان کا قومی

پیش نظر تھا اس لئے انھوں نے تلک کے مرنے پر اختلاف بھلا دیا اور پُر درد انداز میں ان کی شخصیت اور کارہائے نمایاں کا تذکرہ کیا۔ تلک کے مرنے سے چند ماہ قبل یعنی مارچ ۱۹۲۰ء میں وہ یہ الفاظ لکھ چکے تھے:[۱]

"مسٹر تلک کے جو احسانات ملک و قوم پر ہیں انھیں ہم فراموش نہیں کر سکتے مگر مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی تمام زندگی کا طرز عمل ایسا رہا ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سوشل اصلاح کے معاملہ میں آپ نے ہمیشہ آزاد خیالی اور جمہوریت کے اصولوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اپنے کم نصیب ہم جنسوں (کرا) کی سوشل غلامی قائم رکھنے میں آپ کو ذرا بھی دریغ نہیں ہے۔"

موت دشمنی اور اختلافات کو کم کر دیتی ہے چنانچہ جیسے ہی تلک کا انتقال ہوتا ہے چکبست اپنے تمام اختلافات ختم کر دیتے ہیں اور ان کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ دراصل یہ چکبست کی سیرت تھی کہ وہ اتنے ذہنی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود اس شخص کی خدمات کے معترف تھے۔

ان نوحوں کا جائزہ لینے سے یہ بات صاف طور پر نمایاں ہو جاتی ہے کہ چکبست، میر انیس سے بے حد متاثر تھے۔ وہی سادگی۔ وہی انداز بیان۔ وہی تصویر کشی، وہی جذبات کی صحیح مصوری موجود ہے جس نے میر صاحب کی شاعری کو درجہ کمال عطا کیا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی ان کے اور میر صاحب کے مرثیوں میں فرق ہے۔ انیس محبت اہل بیت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چکبست کے نوحے عام انسان کے نوحے ہیں جو نوحے مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ مرثیے کے عام انداز اور معینہ عناصر مثلاً چہرہ۔ رخصت۔ سراپا۔ آمد۔ رجز۔ مناظر جنگ۔ مناظر قدرت۔ گھوڑے کی تعریف وغیرہ سے خالی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مسدس کی شکل میں نوحے لکھے ہیں جس کی وجہ سے بعض حضرات اکثر کہہ دیتے ہیں کہ چکبست مرثیہ میں انیس کے نقال ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:[۲]

---

[۱] رسالہ صبح امید۔ اڈیٹر برج نرائن چکبست مارچ ۱۹۲۰ء صفحہ ۴

[۲] مضمون پنڈت برج نرائن چکبست۔ یادگار چکبست صفحہ ۵۹

"انیس کی طرح چکبست نے بھی اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ زیادہ تر مسدس کو بنایا ہے۔ لوگ اکثر کہہ بیٹھتے ہیں کہ چکبست میں ذاتی کمال نہ تھا بلکہ وہ انیس مرحوم کے نقال تھے۔ ان کم فہموں کو کون سمجھائے کہ کسی کامل الفن کی اس کے فن میں نقل کر لینا خود کمال کی دلیل ہے۔ تاج محل کی سنگ تراشی کو دیکھ کر کوئی پتھر کے ویسے ہی بیل بوٹے بنانے لگے تو کیا وہ ماہر سنگ تراش نہ ٹھہرے گا؟ سیکسپیر کے ڈرامے پڑھ کر کوئی ویسے ہی ڈرامے لکھنے لگے تو کیا وہ کامل تمثیل نگار نہ قرار دیا جائے گا؟ فنون لطیفہ کی نقل کے لئے بھی کمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر چکبست انیس کی نقل کرتے بھی ہیں تو صرف انداز بیان میں۔ خیالات و جذبات ہمیشہ اپنے رکھتے ہیں اس کا ثبوت ان کی ہر نظم سے مل سکتا ہے"۔

چکبست نے جس انداز کے مرثیے لکھے ہیں ان میں کوئی ڈرامائی انداز کے مرثیے لکھے ہیں نہ ان میں کوئی ڈرامائی انداز ممکن تھا اور نہ وہ موجود ہے۔ یہی وہ اہم چیز ہے جو میر صاحب کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ اس لئے اگر غور کیا جائے تو چکبست کے نوحوں میں انیس کے اثرات ہوتے ہوئے بھی مرثیوں کی وہ خصوصیات نہیں ہیں جنھیں مرثیوں میں تلاش کیا جاتا رہا ہے۔

اگر چکبست کے نوحوں کا جائزہ لیا جائے تو صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے یہاں جو خارجی عناصر ہیں ان میں داخلیت کی بھی چاشنی ملی ہوتی ہے۔ اس کے متعلق مسعود صاحب فرماتے ہیں[۱]:-

"ہماری قدیم شاعری میں داخلیت کا غلبہ تھا۔ جدید شاعری میں خارجیت کا پہلو نمایاں ہے۔ قدیم شاعری میں جو مرتبہ نفس کا تھا جدید شاعری میں وہی درجہ مشاہدۂ حیات کو حاصل ہے۔ چکبست کے یہاں خارجی عنصر کی زیادتی ہے مگر داخلیت کی آمیزش کے ساتھ مشاہدے اور مراقبے کی اس دلکش امتزاج کا نتیجہ ہے کہ چکبست کا کلام ان لوگوں کو بھی اجنبی نہیں معلوم ہوتا جو شاعری کو قدیم معیار سے جانچتے ہیں"۔

---

[۱] مضمون پنڈت برج نرائن چکبست - یادگار چکبست صفحہ ۴۴

"داخلیت اور خارجیت کے اس امتزاج کو مسعود صاحب نے واضح کر دیا ہے۔ چکبست کے تمام نوحے عزیزوں، دوستوں اور رہبروں کے نوحے ہیں جو دراصل دل کی کسک ہے جو شعر کی صورت سے نمایاں ہوتی ہے۔

چکبست حقیقی وطنیت اور صحیح قومیت کے دلدادہ تھے۔ ان کا مسلک تھا کہ ہندوستان ہندوستانیوں کا ملک ہے وہ خواہ انگریز ہوں خواہ کوئی اور ہوں لیکن جو ہندوستان کے باشندے ہیں ان کو ہندوستان کو بلند مقام پر لے جانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور یہی بات ان کی غزلوں، نوحوں اور نظموں میں ہر جگہ نمایاں ہوتی ہے۔

اکثر حضرات یہ کہتے ہیں کہ چکبست کے تمام نوحے ایک طرح کے ہیں اگر ان حضرات کا نام نہ لکھا ہو جن کے مرنے پر وہ لکھے گئے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک ہی ہیں۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ مسعود حسن صاحب کے الفاظ میں[۱]:-

"چکبست کی نظموں میں ان کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کو متعدد لوگوں کی وفات پر دلی صدمہ ہوا لیکن نہ یہ سب ایک طرح کے تھے نہ ان کے انتقال کا غم ایک طرح کا ہو سکتا تھا۔ ان مختلف طرح کے غموں کو اس طرح ظاہر کرنا کہ ان کا فرق نوعیت یا فرق مراتب ظاہر ہو بڑا مشکل کام ہے۔ چکبست نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔"

مرثیہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ سننے والا اس سے بعید متاثر ہو اور اس میں بھی مرنے والے اور اس کے عزیزوں سے ہمدردی پیدا ہو۔ چکبست کے نوحے انفرادی محبت اور حب وطن کا آئینہ ہیں۔ وہ برابر مرنے والے پر کچھ اس طرح سے خون کے آنسو بہاتے ہیں کہ سننے والا متاثر ضرور ہو جاتا ہے اور یہی چیز ان کے نوحے کو درجۂ کمال عطا کرتی ہے

---

[۱] مضمون پنڈت برج نرائن چکبست۔ یادگار چکبست صفحہ ۵۰

انیس مرحوم سے متاثر ہونے کی وجہ سے چکبست کے نوحوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز طریقہ پر ملتا ہے۔ انھوں نے ہو بہو اظہار جذبات کرکے اس میں کمال حاصل کیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ شاعری صحیح جذبات کی عکاس ہو سکتی ہے۔ ان کا سارا کلام اور خاص کر نوحے مبالغہ اور خیال آرائی سے پاک وصاف ہیں۔

چکبست کی شاعری کے دوسرے حصوں کی طرح نوحوں میں بھی صنائع وبدائع کا استعمال ہے لیکن کم۔ ان نوحوں کی زبان بھی عام فہم، سلیس اور پر اثر ہے۔

ان کی نظموں میں ایک بہت ہی اہم وپر اثر اور شاعرانہ لطافتوں سے بھرپور نظم رامائن کا سین ہے جس میں رام چندر جی کے بن باس جانے کے وقت ماں سے رخصت ہونے کا منظر دل دوز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مرثیہ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ نظم مرثیہ اور نوحہ کی خصوصیات کو اپنے اندر رکھتی ہے اس لئے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کا ذکر بھی یہیں پر کر دیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو بوڑھی ماں اپنے اکلوتے چہیتے بیٹے سے چودہ برس کے لئے جدا ہو رہی ہے۔ اس کے احساسات اور جذبات نوحے اور مرثیے ہی کی شکل میں اختیار کر سکتے ہیں اور یہی صورت حال اس نظم میں موجود ہے۔

چکبست مرحوم نے رامائن کا اردو ترجمہ نظم کی صورت میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ احتشام صاحب کا ارشاد ہے کہ :۔

"مجھ سے پنڈت کشن پرشاد کول صاحب مرحوم نے اکثر اس بات کا تذکرہ کیا کہ چکبست نے رامائن کے کئی سین لکھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ساری رامائن کا اسی طرح سے ترجمہ پیش کر دیں۔ ان شائع شدہ بندوں کے علاوہ بھی چکبست نے انھیں بعض سین سنائے تھے۔ جس سے پتا چلتا تھا کہ انھوں نے کافی حصہ نظم کر لیا تھا لیکن میری تلاش کے باوجود وہ ان کے مرنے کے بعد دستیاب نہیں ہوئے"

یہ بالکل صحیح ہے کہ چکبست نے اس نظم کے کئی اور سین لکھے تھے کیونکہ چکبست کی غیر مطبوعہ چیزوں کی تلاش میں مزید تین بند مختلف جگہوں کے دستیاب

بھی ہوئے ہیں جو ضمیمہ کی شکل میں اس مقالہ کے ساتھ شامل ہیں۔

راماٸن کا سین جوان کے مجموعے میں موجود ہے ان کے عام نوحوں کے رنگ سے بالکل الگ ہے۔ اس میں وہ انیس کے صحیح مقلد نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اگر انھوں نے یہ نظم مکمل کر لی ہوتی تو وہ میر انیس کے مرثیہ کی سی ہوتی جس وقت رام چندر جی اپنی ماں کے پاس رخصت ہونے کے لئے پہونچتے ہیں اس وقت ماں کی حالت اور رام چندر جی کے صبر کی جو تصویر چکبست نے پیش کی ہے وہ قابل غور ہے ؎

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال ۔۔۔ خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در پہ ہے بیٹھی وہ خستہ حال ۔۔۔ سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بیگناہ ۔۔۔ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ ۔۔۔ لی گوشہ ہائے چشم سے آنکھوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زبان کی طرح بولنے لگا

ایک ماں کے اکلوتے بیٹے کو چودہ برس کے لئے جنگل بھیجا جا رہا ہے۔ ماں۔ باپ۔ عزیز۔ سلطنت ہر چیز سے جدا کر کے اس کو ایک ایسے سفر پر روانہ کیا جا رہا ہے جس کی منزل کا پتا نہیں اور نہ یہی یقین ہے کہ وہ واپس بھی آ سکے گا۔ ماں کے جذبات سینے میں موجزن ہیں لیکن بڑی مشکل سے زبان پر آتے ہیں ؎

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا ۔۔۔ افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالم چرخِ کہن کھلا ۔۔۔ وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

چکبست عورت کے صحیح جذبات جس طرح سے پیش کرتے ہیں اس کو پڑھ کر میر انیس کا کلام یاد آ جاتا ہے۔ کیونکہ مرثیوں میں بھی رخصت کے مناظر بار بار اور گوناگوں

شکلوں میں پیش کئے گئے ہیں۔

عورت کی نفسیات کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ انتہائے غم کی حالت میں طنز و تعریض سے کام لے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔ چنانچہ رام چندر جی کی ماں کوشلیا بھی اپنی سوتن کیکئی (یعنی بھرت کی ماں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس سازش کا ذکر کرتی ہے جس کی وجہ سے رام چندر جی کو چودہ برس کے لئے جلا وطن ہونا پڑا ؎

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید ـــ اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید ـــ سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

عورت جب مجبور ہو جاتی ہے اس وقت وہ اپنی قسمت کی شکایت کرتی ہے ذرا رام چندر جی کی ماں کی شکایت سنیے ؎

لیتی کبھی فقیر کے گھر میں اگر جنم ـــ ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم ـــ تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

اب رام چندر جی کا جواب دیکھئے ماں کو سمجھا بجھا کے اجازت لیتے ہیں کیونکہ باپ کے حکم کو پورا کرنا ہے۔ اپنی حالت کی فکر ہے لیکن پھر بھی ماں کو سمجھاتے ہیں ؎

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام ـــ بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام ـــ قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہو گا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

رام چندر جی کے سمجھانے کا ماں پر کچھ اثر نہ ہوا اس کے بعد جو ماں کہتی ہے وہ اسکے صحیح جذبات ہیں ؎

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر ـــ ہنس کر وفور یاس سے لڑکے پہ کی نظر

چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گزر
پنہاں جو بے کسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی دردنی تھی نگاہوں میں آگئی

ساری نظم میں میر انیس کے انداز کی جھلک ہے۔ اس میں وہی ڈراما کا عظمت سنجیدگی، گہرائی اور غم انگیزی ہے جو مرثیوں میں نظر آتی ہے۔ چکبست کی اس نظم میں ڈرامائی انداز بھی پیدا ہو گیا ہے جو فنی حیثیت سے بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان کے نوحے جذبات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ وہی رنج و غم جس سے انسان دوچار ہوتا ہے۔ ان کے نوحے کی جان ہے۔ ان کی ساری شاعری قومی شاعری ہے جو مرثیہ میں بھی موجود ہے۔

مرنے والوں کی مناسبت سے نوحوں کا موضوع انفرادی یا قومی ہو سکتا ہے۔ چکبست نے دونوں قسم کے نوحے لکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انفرادی غم کو قومی غم میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا اس لئے چکبست کے وہ نوحے جو ان کے عزیزوں کے متعلق ہیں محض ان کے ذاتی جذبات کا پتا دیتے ہیں لیکن جیسے ہی کسی ایسے مرنے والے کا ذکر آتا ہے جو قومی حیثیت بھی رکھتا ہے ویسے ہی چکبست کے خیالات کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے نوحوں کو ایک طرح کی قومی نظم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کے اشاروں اور مثالوں سے واضح ہو گیا ہے۔

انھوں نے اپنے نوحوں میں کسی خاص فلسفہ کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ جس طرح سے اقبال "والدہ مرحومہ کی یاد میں" والدہ کا تھوڑا سا ذکر کرنے کے بعد موت کے فلسفہ پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔ دراصل چکبست حب قومی سے سرمست اور سرشار تھے۔ یہی ان کی شاعری کی روح ہے۔

نثر نگاری

شعر و شاعری سے دلچسپی لینے والے چکبست کے مجموعۂ کلام صبح وطن کے مطالعہ سے اپنے دل و دماغ کو فرحت بخشنے کا سامان کرتے ہیں لیکن ادب اُردو کے عام ارتقا پر غور کرنے والے صرف صبح وطن پر خاموش نہیں بیٹھیں گے بلکہ چکبست کی مجموعی ادبی خدمات کا جائزہ لیں گے اس وقت انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ چکبست کو لوگوں نے پہلے پہل ایک نقاد کی حیثیت سے جانا۔ گلزار نسیم کے مباحثوں نے ان کو عوام سے روشناس ہی نہیں کرایا بلکہ ان کو ادب اُردو میں ایک خاص مقام پر کھڑا کر دیا۔

بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ پیاجان عالم کا لکھنؤ انیس سا عدیم المثال معجز بیان شاعر تو پیدا کر سکا لیکن آزاد سا انشا پرداز پروان نہ چڑھا سکا[۱]۔

اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ میں محمد حسین آزاد تو پیدا نہ ہو سکے لیکن ادب کی بدلتی ہوئی حالت کو لکھنؤ نے بھی اپنانے کی کوشش کی اور اس نے برابر ایسے نثار پیدا کئے جنھوں نے حالی اور آزاد ہی کی طرح ادب اُردو میں اپنا مقام حاصل کر لیا۔ سجاد حسین۔ سرشار۔ رسوا۔ شرر کو اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور اس دور کے آخری ادیب۔ نقاد رصاحب قلم پنڈت برج نرائن چکبست بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔

یقین کے ساتھ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ چکبست نے نثر میں جو مضامین لکھے ان کی ابتدا کب اور کس مضمون . . . .

---

[۱] "پنڈت برج نرائن چکبست بحیثیت ایک نثر نگار کے" از مولانا سید اختر علی صاحب تلہری۔ رسالہ ادب۔ صفحہ ۳ دسمبر ۱۹۳۰ء

سے ہوئی۔ لیکن یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ان کے مضامین محض اتنے ہی نہیں ہیں جتنے مضامین چکبست۔ میں شامل ہیں، بلکہ ان کے علاوہ بھی بعض مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین اودھ پنچ۔ صبح امید بعض کتابوں کے دیباچے۔ صبح اُمید کے ایڈیٹوریل۔ معرکہ چکبست و شرر کے بعض مضامین کشمیر درپن۔ زمانہ۔ ادیب۔ اُردوئے معلی۔ اودھ پنچ۔ زمانہ۔ اور تہذیب میں شائع ہوئے۔ بعد میں خود انھوں نے ایک رسالہ صبح امید کے نام سے اکتوبر ۱۹۱۲ء سے نکالنا شروع کیا مگر وہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ اس رسالہ کے اداری مضامین تقریباً سب کے سب خود چکبست ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔

چکبست کے ۲۰ مضامین "مضامین چکبست" کی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں مگر "مضامین چکبست" کا جائزہ لیا جائے تو ۱۹۰۳ء میں تین مضامین پنڈت دیا شنکر نسیم۔ سرسوتی اور ہجر پر ۱۹۰۴ء میں تین "ذات کی تفریق"۔ "رتن ناتھ سرشار" "دیباچہ گلزار نسیم"۔ ۱۹۰۵ء میں تین "داغ" "سرور" "گلزار نسیم" ۱۹۰۶ء میں "عبارت درپن"۔ ۱۹۰۸ء میں "دادا بھائی نوروجی" اس کے بعد دو سال یعنی ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء میں کوئی مضامین نہیں ملتے۔ ۱۹۱۰ء میں پھر دو مضامین "ایک یادگار مشاعرہ" اور "لبھن نرائن در" ملتے ہیں۔ اس کے بعد چار سال تک کسی مضمون کا پتا نہیں چلتا۔ ۱۹۱۵ء میں پانچ مضامین "اودھ پنچ"۔ "منشی سجاد حسین"۔ "ظریف" "آزاد اور" "برق" پر ملتے ہیں۔ اور آخر میں ۱۹۱۶ء کا ایک مضمون "اُردو شاعری" ملتا ہے اس طور سے اگر ان مضامین پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کسی خاص سلسلے کے ساتھ یا خاص طور پر مضامین نہیں لکھے بلکہ جب کوئی خاص بات ذہن میں آئی اُسی وقت ایک مضمون لکھ ڈالا۔

چکبست کے مضامین تین حصّوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ پہلی قسم تنقیدی مضامین کی ہے۔ ان میں پنڈت دیا شنکر نسیم۔ تربھون ناتھ ہجر۔ رتن ناتھ سرشار۔ داغ۔ لچھمی نرائن سرور۔ دیباچہ گلزار نسیم اور گلزار نسیم شامل کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری قسم سماجی اور تاریخی ہے انھیں "ذات کی تفریق"

"تاریخ بھارت درپن" آتے ہیں۔ تیسری قسم ان مضامین کی ہے جنھیں سیاسی کہہ سکتے ہیں۔ جن میں پنڈت بشن نرائن در اور دادا بھائی نوروجی پر لکھے ہوئے مضامین ملتے ہیں۔ مضامین چکبست کے علاوہ ان کے بعض ادبی اور سیاسی مضامین اودھ پنچ اور صبح امید میں بھی ملتے ہیں، جن میں سے بعض وقتی مسائل پر فی الفور لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو نظر انداز کر دینے سے چکبست کی نثر نگاری کے متعلق رائے قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ان کا اصل نثری کارنامہ مضامین چکبست ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا پھر ان کا ڈراما کملا ہے جس کی جانب ابھی تک توجہ نہیں کی گئی ہے۔

مضامین چکبست میں جو مضامین شامل ہیں ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے صرف "اردو شاعری" ہی ایک ایسا مضمون ہے جسے ہم اصول تنقید یا تنقید شعر کے لحاظ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی سے چکبست کے ان خیالات کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ شاعری کے متعلق رکھتے تھے۔ اس سے ان کے خیالات پر مغربی اثرات کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ان خیالات میں مشرقیت کے عناصر بھی متوازن انداز میں پائے جاتے ہیں۔ اس مضمون کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے تنقید کو سنجیدگی کے ساتھ کس بلند منزل تک پہونچانے کی کوشش کی ہے۔[1]

"نفس شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے وہ ویسا ہے کہ سُریلی آواز کے سننے سے یا دریا کی لہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل میں جو کیفیت طاری ہوتی ہے اُس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری زبان کے جادو کی تشریح و تعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے، مگر بادی النظر میں شاعری کے دو پہلو ہیں ایک کا تعلق خیالات سے ہے۔ دوسرے کا زبان سے جس کو خیالات کا پیرہن یا لباس سمجھنا چاہیئے۔ خیالات کا اظہار پاکیزہ اور سلیس نثر میں بھی لطافت کے ساتھ ہو سکتا

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۲۰۳

ہے مگر شاعر کے خیالات دلی جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلتے ہیں اور زبان میں خاص اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعرانہ خیالات کے پھولوں کی نشو و نما محض دماغ کی پھلواری تک محدود نہیں رہتی ہے۔ شاعر کے دلی جذبات کی برقی حرارت ان پھولوں کا عطر کھینچ لیتی ہے۔ اس کا نام شاعرانہ تاثیر و لطافت ہے۔ اس شاعرانہ تاثیر یا لطافت کے عام کرنے کا ذریعہ شاعرانہ زبان ہے۔ شاعر بھی وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس کے ہم وطنوں کی زبان پر ہوتے ہیں مگر انھیں الفاظ کی الٹ پھیر سے وہ اپنے بیان میں عالم تصویر پیدا کر دیتا ہے۔ اور محض عالم تصویر ہی نہیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے الفاظ میں ایک راگ کی تاثیر نمایاں ہو جاتی ہے جو فن موسیقی کے راگ راگنی سے الگ ہے۔ اگر انگریزی شاعری کو اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہمارے تعلیم یافتہ مغربی نظم کے پڑھنے سے دماغی حظ ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن نہ انداز کلام کی شاعرانہ لطافت ان کے دلوں میں برقی حرارت پیدا کرتی ہے نہ زبان کی مصوّری کا انھیں حس ہوتا ہے نہ الفاظ کا راگ ان کے کانوں کی فضا میں سما جاتا ہے۔ ان کا دماغ یہ خوب پہچان لیتا ہے کہ کس قسم کے خیالات نظم کیے گئے ہیں مگر ان کا دل جیسے جذبات کا ذخیرہ خیال کرنا چاہیئے یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان خیالات ادا کرنے کا شاعرانہ انداز کیا ہے۔ ان کے کان یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر نے معمولی الفاظ میں کیا جادو بھر دیا ہے۔"

چکبست نے شاعری کی تعریف اور اثر کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ نئے نہیں اگر مولانا حالی مرحوم کے مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہی خیالات دوسرے الفاظ کے جامعہ میں وہاں بھی نظر آئیں گے۔ تعجب ہوتا ہے جب چکبست کے اختلافات جو مولانا حالی سے ہیں نظر آتے ہیں۔ اور فن تنقید میں انھیں اصولوں کو برتتے ہیں جو مولانا حالی نے برتے ہیں۔

غالباً مولانا حالی نے جو گلزار نسیم پر اعتراض کئے اور ساتھ ہی لکھنؤ میں مولانا کی جو مخالفت تھی اس سے متاثر ہو کر چکبست مولانا کے مخالف بن گئے تھے۔ مگر جن اصولوں کو انھوں نے مناسب خیال کیا ان کو اپنانے کی بھی کوشش کی۔

چکبست کی معلومات وسیع اور تحقیق و تدقیق کا ذوق حیرت انگیز تھا۔ اردو زبان میں مہارت کے ساتھ ساتھ انگریزی علم و ادب کے معیار تنقید سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے غیر جانبدارانہ پہلو مد نظر رکھتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں جب ان کو گلزار نسیم کا صحیح نسخہ ہاتھ آیا تو انھوں نے حالی کی مخالفت کھل کر کی۔ اور جو اعتراضات مولانا نے گلزار نسیم پر کئے تھے ان کے جوابات دیباچہ گلزار نسیم میں دیے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں[۵]:-

"اس زمانہ میں مولانا حالی نے گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم سے پامال کرنا چاہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے۔ مصنف گلزار نسیم نے اس کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ گلزار نسیم میں دو شعر اس صورت پر ہیں ؎

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے
ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

جو مطلب کہ مصنف ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ تو اس طفل مہ جبیں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے مگر نجومیوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ لڑکے سے آپ کو پیار تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکے گا (کیونکہ اس کو دیکھ کر

۵؎ مضامین چکبست۔ صفحہ ۱۳۹

بینائی جاتی رہے گی) ظاہر ہے کہ ان دونوں بیتوں میں جب تک کئی لفظ بڑھائے اور بدلے نہ جائیں تب تک مطلب جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا ہے اور نہ ایک مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا تیسرے سے چسپاں ہو سکتا ہے (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۵) اس کے جواب میں صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ مولانا حالی گلزار نسیم کا کوئی صحیح نسخہ ملاحظہ فرماتے تو مولانا موصوف کو اس اعتراض کی تکلیف نہ گوارہ کرنی پڑتی۔ آج کل گلزار نسیم کے بے شمار نسخے شائع ہوئے ہیں جن میں سیکڑوں جگہ کاتب کی اصلاحیں ہوتی ہیں اور تو اور اکثر اشعار ان نسخوں سے غائب ہیں اور جو موجود ہیں ان کی ترتیب میں غلطی ہے۔ چنانچہ یہ دو شعر بھی جو مولانا حالی کی طبع گرامی کے بار خاطر ہوئے صحیح نسخے میں اس صورت میں ہیں ؎

خوش ہوتی ہے طفل مہ جبیں سے
ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو

اب مطلب صاف ہے اور مصرعوں میں کامل ربط ہے یعنی طفل مہ جبیں سے خوشی ہوتی ہے ستارہ بیں سے یہ ثابت ہوا یہ لڑکا پیارا تو ہے مگر اس کو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیے گا۔"

اس طرح سے مولانا حالی کے سب اعتراضات کا چکبست نے جواب دیا ہے۔ مولانا سے جو مخالفت ہے وہ ان کے اکثر مضامین سے نمایاں ہے۔

چکبست کی تنقید "معرکہ شرر و چکبست" میں پہلی مرتبہ اپنا حسن نمایاں کرتی ہے۔ ۱۹۰۴ء میں پنڈت ترلوکی ناتھ کول صاحب نے ایک صحیح نسخہ چکبست کو دیا انھوں نے اس پر ایک دیباچہ لکھ کر ۱۹۰۵ء میں شائع کر دیا۔ مارچ و اپریل کے رسالہ دلگداز میں مولانا عبد الحلیم شرر نے اس پر زبردست ریویو شائع کیا۔

جس میں تین عنوان قائم کئے :-

(۱) گلزار نسیم آتش مرحوم کی تصنیف ہے۔

(۲) اس کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے۔

(۳) گلزار نسیم پر اعتراضات پیش کئے گئے۔

۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء کے اودھ پنچ میں ایک ایڈیٹوریل نکلا جس میں اعتراضات کا جواب دیا گیا اور خاص طور پر پہلے اور دوسرے اعتراض کو ملا کر یہ زبردست بات کہی گئی کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف ہے تو اس کی زبان پر اعتراض کرنا گویا لکھنؤ کی زبان پر اعتراض کرنا ہوگا، کیونکہ آتش کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان ہے۔ اس کے ۱۶ر جون ۱۹۰۵ء کے ریاض الاخبار میں ایک مضمون (بدلہ) کے نام سے شائع ہوا جس میں ۱۱ر مئی کے اودھ پنچ والے جواب کا خوب مذاق اُڑایا گیا۔ اور یہاں تک لکھ دیا گیا کہ اس کا لکھنے والا فاتر العقل ہے۔ اس زمانہ میں پیام یار کے پرچوں میں بھی اس طرح کے مضامین شائع ہوئے اور ساتھ ہی اس مضمون میں منشی سجاد حسین کے متعلق لکھا :-

"منشی سجاد حسین صاحب نے کچھ ایسی گھڑی جنم لیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کا جب کوئی جھگڑا پیش ہوتا ہے وہ ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں اور اسی اصول پر گلزار نسیم کی طرف داری کر رہے ہیں"

یہاں سے گویا مولانا شرر نے اس جھگڑے کو مذہبی رنگ دینا چاہا۔ اس کے بعد ۲۹ر جون ۱۹۰۵ء کے اودھ پنچ میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں مولانا شرر کے ان جملوں کا لطیف پیرائے میں جواب دیا گیا ہے جس کے بعد پیام یار میں پھر ایک مضمون شائع ہوا جس میں سجاد حسین کے جواب میں بیہودہ اور فحش جملے استعمال کئے گئے اب اودھ پنچ کے نامہ نگاروں نے خامہ فرسائی شروع کی اور جان صاحب کی ریختی نکلی اور ۲۰ر جولائی ۱۹۰۵ء سے آتش کے مشہور خطوط کا سلسلہ شروع ہوا ابھی آتش کے دو خط ہی نکلے تھے کہ منشی احمد علی شوق کا معرکۃ آرا مضمون ۳ر اگست ۱۹۰۵ء کے اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ ۹ر اگست کے اتحاد

میں شرر نے اودھ پنچ کو "شہدا" قرار دے کر ان کی شان میں نامناسب اور گندے فقرے استعمال کئے لیکن احمد علی شوق کے مراسلہ کا جواب شرر سے نہ ہو سکا۔ اس کے بعد پھر شوق کا دوسرا مضمون ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء کو شائع ہوا یہاں سے گویا باقاعدہ اعتراض۔ جواب۔ جواب الجواب کا قضیہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۶ء تک چلتا رہا جب کہ بعض حضرات نے مخالفت اور بعض نے موافقت میں مضامین شائع کئے۔ خاص کر نقاد کے رسالہ زمانہ کا پنور جون ۱۹۰۵ء میں، دکھن ریویو میں حافظ جلیل حسین جلیل کے دو مضامین جولائی اور اگست ۱۹۰۵ء میں، دبدبۂ آصفی میں ضامن کنتوری کا مضمون، رسالہ زمانہ کانپور۔ اپریل ۱۹۰۶ء میں ہوا خواہ نسیم کے نام سے دو مضامین، رسالہ تہذیب میں جون ۱۹۰۶ء میں مظہر الحق کا مضمون۔ جنوری ۱۹۰۶ء کا حکیم برہم کا مضمون، ریاض الاخبار میں اہم مضامین ہیں۔ ان حضرات نے اپنے خیالات اس بحث اور گلزار نسیم دونوں کے متعلق تحریر فرمائے۔ اس جھگڑے میں اس قدر مضامین شائع ہو چکے ہیں کہ اب اس کے متعلق اور بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ مرزا محمد شفیع نے یہ تمام مضامین یکجا کر کے "معرکۂ چکبست و شرر" کے نام سے شائع کرا دیے۔ مرتب کتاب مرزا محمد شفیع چکبست کی تنقید کے متعلق فرماتے ہیں[۵]:-

> "جناب چکبست کا انداز تحریر ایسا ہے جس کو فن تنقید کا ایک اچھا معیار خیال کرنا چاہیئے۔ ہمارے اس بیان کی تائید وہ حضرات کریں گے جنھوں نے جناب چکبست کے وہ مضامین اردوئے معلی اور اودھ پنچ میں پڑھے ہیں جو مولوی شرر کے اعتراضات کے جواب میں شائع ہوئے ہیں اور جن سے حضرت چکبست کے علمی لیاقت کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا۔"

یہ جھگڑا بھی فن تنقید کا ہے لیکن اگر ان کا مضمون "پنڈت رتن ناتھ سرشار" کا جائزہ لیا جائے تو ان کی تنقید اور بلند درجہ پر نظر آئے گی۔ پہلے سرور اور سرشار

۵؎ رسالہ ادب۔ دسمبر ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۶

کی عبارتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"رجب علی بیگ سرور: گرہ کشایان سخن و تازہ کنندگان فسانۂ کہن یعنی محرران رنگیں تحریر و مورخان جادو تقریر نے اشہب جہندہ قلم کو میدان وسیع بیان میں باکرشمہ سحر ساز و لطیفہائے حیرت پرواز گرم عنان و جولان یوں کیا ہے کہ سرزمینِ ختن میں ایک شہر تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار:

سحر کاذب کے وقت مرغ کے ہنگام نے گربہ مسکیں کی آہٹ جو پائی تو گھبرا کر ککڑوں کوں کی بانگ لگائی۔ ہمارے حبیب لبیب دقیقہ رس صبح نفس جو شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سو رہے تھے یہ آواز خوش آئند سنتے ہی کلبلا کر اٹھ بیٹھے ادھر آنکھیں کھلیں اور باچھیں کھل گئیں"

اب چکبست فرماتے ہیں :-

"سرور کی نثر تصنع کے بوجھ سے گراں بار ہے۔ سرشار کی طرز شوخی اور بے تکلفی سے معمور ہے قدرتی جوش اور صفائی بیان مل کر عجیب عالم دکھاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نور کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ برخلاف اس کے سرور کی نثر میں فرضی لطافت اور خیال کی رنگینی کا دخل زیادہ ہے۔ سرور مضامین خیالیہ کی ہوا میں اڑتے ہیں سرشار مضامین حالیہ کی تصویر کشی کرتے ہیں .....

کسی ایک طرح پہ بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

(انیس مرحوم)

سرشار کی زبان دانی کمال کو نہیں پہونچی تھی کہ شراب کے اثر سے ان کے اعضا قبل از وقت کمزور ہونے لگے اور اعضا کی کمزوری کے ساتھ دل و دماغ بھی کمزور ہوتے گئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ

قلم کی لغزشیں ان کے قصوں اور افسانوں میں ظاہر ہونے لگیں۔"
مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ چکبست کو فن تنقید میں کس قدر کمال حاصل تھا ساتھ ہی یہ کہ اُردو زبان پر ان کو کس قدر عبور تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زبان دانی کیا چیز ہے اور وہ خصوصیات اور خامیوں کو پوری طرح سے نمایاں کرنے کے قائل تھے جو نقاد کا فرض اوّل ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین ان کی تنقید سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں[1] :-

"سب سے پہلی چیز جو ہمیں چکبست کے مضامین میں متاثر کرتی ہے وہ ان کی تنقید کا صحیح معیار ہے ان کو زبان پر بڑی حد تک قدرت حاصل تھی اور اسی نئے خیالات کے اظہار میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ نہایت صاف الفاظ میں کہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے تنقید کے اصول کا صحیح طور پیشِ نظر رکھ کر کہتے تھے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر مضامین ان لوگوں پر لکھے ہیں جن سے انھیں عقیدت تھی یا جن سے وہ محبت رکھتے تھے لیکن پھر بھی عصبیت کا نام تک نظر نہیں آتا وہ کمزوریوں کا اظہار اسی بے باکی سے کرتے ہیں جس طرح محاسن بیان کرتے ہیں۔ متانت اور منصف مزاجی ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب گلزار نسیم کی اشاعت کر کے ان کو ایک ہنگامہ سے دوچار ہونا پڑا اس وقت بھی انھوں نے نہائت متانت اور سنجیدگی سے اس ادبی معرکہ میں قدم رکھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھ دینا غیر موزوں نہ ہوگا کہ ان کا مباحثہ دلائل براہین سے بھرا ہوتا تھا اور ہر اعتراض کی تہ تک پہونچ کر ۔۔۔ بیخ کنی کی کوشش کرتے تھے اور ان کی فطری ذہانت اور جدت ان کی دستگیر ہوتی تھی۔ اس لئے ان کا تیر ہمیشہ نشانے پر ٹھیک بیٹھتا تھا۔ ممکن ہے کہ مباحثہ کا یہ انداز ان کے پیشے نے

---

[1] مختصر تاریخ ادب اُردو۔ از ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب صفحہ ۴۲۰ بار دوم ۱۹۴۰ء

سکھا دیا ہو۔"

چکبست کے مضامین کو محض نثری کاوشیں سمجھ کر دیکھنا کافی نہیں ہے بلکہ ان کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بے نظیر نقاد بھی تھے۔ اردو تنقید جس کی عمر ابھی بہت مختصر تھی، تنقید کے بہت سے ایسے نمونے پیش نہیں کر سکتی جو ہمیں چکبست کے بعض مضامین میں ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مضمون دیکھئے جو انھوں نے داغ کی وفات پر لکھا ہے۔ یہ مضمون تنقیدی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں داغ کا ادبی احترام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن ان کے کلام کے متعلق رائے نہایت آزادی سے دی گئی ہے۔ اس مضمون کو شروع کرتے ہوئے فرماتے ہیں[1]:۔

"افسوس کا مقام ہے کہ اردو شاعری کے آخری دور کا آخری شاعر قدردانان سخن کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔ مدت ہوئی کہ نظم اردو کے شباب کی تاروں بھری رات خاتمہ پر آ چکی تھی۔ پچھلے پہر کا ایک تارا باقی رہ گیا تھا۔ جس کی روشنی دم بدم گھٹتی جا رہی تھی آخر کار یہ تارا بھی ہماری نظروں سے پنہاں ہو گیا اور اسی کے ساتھ قدیم مذاق سخن کا چراغ سحری بھی گل ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن ہی کی خاک پر چمنستان نظم اردو کی داغ بیل ڈالی گئی تھی اور اسی چمن کا یہ آخری پھول جو دہلی کا رنگین مزاج اور شوخ طبع شاعر تھا جس کی روح آج فردوس میں کسی روح کے گیسو میں بو کی طرح سمائی ہو گی۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

اس کے بعد جن خیالات کی روشنی میں داغ کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں ان کو اس طرح پیش کرتے ہیں[2]:۔

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۶۵

[2] مضامین چکبست صفحہ ۶۸

"اب دیکھنا چاہیئے کہ شاعری کا اصلی مفہوم کیا ہے؟ شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اس کے جذبات دل کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کردیتے ہیں اور چونکہ شاعر کے کانوں کی فضا میں سلاست زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ ان میں علاوہ عالم تاثیر کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کے ان خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے۔ جو اس کے جذبات دل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اس کی زبان سے نکلتے ہیں۔ غرض کہ جذبات شاعری کے روح رواں ہیں اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے لہٰذا جس قسم کے جذبات کے رنگ میں شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہوگا وہ اسی قسم کے جذبات سامع کے دل میں بھی جوش۔۔ لائے گا"

ان اصولوں کی وضاحت کرنے کے بعد جب وہ داغ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی تنقیدی صلاحیت بہت نمایاں ہوجاتی ہے[1]:-

"داغ کی شاعری کے لئے سب سے موزوں لقب "عیاشانہ شاعری" ہے۔ اکثر حضرات فرماتے ہیں کہ داغ کا کلام دل میں چٹکی لیتا ہے یہ بات آتش و ذوق و غالب وغیرہ کو نصیب نہیں، مگر ان حضرات کو یہ خیال کرلینا چاہیئے کہ داغ کا کلام کس قسم کی چٹکی لیتا ہے۔ یعنی کس قسم کی تاثیر پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی حسین یا حیا پرور صورت نظر آئے یا کسی شاداب چمن یا دلفریب منظر کی سیر نصیب ہو تو انسان کے دل کو ایک روحانی سرور حاصل ہوتا ہے اس کا نام بھی تاثیر ہے اور میں کہوں گا کہ آتش وغیرہ کی شاعری اسی قسم کی تاثیر سے

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۴۹

مالا مال ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی چرب زبان عورت بانکا دوپٹہ اوڑھ کر سامنے سے نکل جائے تب بھی ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کو بھی تاثیر کہیں گے۔ داغ کا کلام سننے سے اسی قسم کی تاثیر دل میں پیدا ہوتی ہے۔"

داغ کے کلام کا جس طرح سے انھوں نے جائزہ لیا ہے اس سے ان کے تنقیدی خیالات کا مکمل اندازہ ہو جاتا ہے۔

چکبست کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس موضوع پر مضمون لکھتے ہیں اس کے اعتبار سے طرز تحریر بھی اختیار کرتے ہیں۔ تنقیدی مضامین میں متانت۔ استدلال اور تحقیق جلوہ گر ہے تو تاریخی مضامین میں عالمانہ انداز نظر۔ تفکر اور صحت بیان نمایاں ہے۔ "تاریخ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کا ایک حصہ دیکھئے:۔

"موجودہ تہذیب کا یہ علمی اصول ہے کہ دنیا میں جس قدر رسم و رواج ہیں وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور میں آئے ہیں فن تاریخ بھی اس حالت سے مستثنیٰ نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے موجودہ زمانے تک یہ فن مختلف تہذیبوں کے مختلف سانچے میں ڈھلتا چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دنیا میں آئے ہوئے بہت دن گذرے تھے۔ قدرت کے کارخانے اس کے لئے معجزے سے کم نہ تھے اس عالم حیرت میں اس کی نگاہوں کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گذرتے تھے وہ اس کے دل پر عجیب اثر پیدا کرتے تھے مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ کبھی دن بڑھے ہوتے ہیں کبھی راتیں، کبھی چاند سورج سیاہی میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی سردی زور وشور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے، کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ شروع شروع میں وہ قدرت کے کارخانوں میں کوئی انتظام با ترتیب ٹھہراتا ہے۔"

سیاسی مضامین میں حالات کو پوری طرح روشن کر دینا اور صاف اور واضح

خیالات ان کی نثر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مسٹر تلک کے انتقال کے بعد صبح امید میں جو تحریر فرمایا ہے وہ قابل غور ہے :-

"مسٹر تلک کی زندگی ایک مسلسل جنگ تھی۔ ایک طوفان۔ ایک طرف حکومت پسند طبقہ کی ناانصافی اور غرور کی قوتیں صف بستہ تھیں دوسری جانب مسٹر تلک کی ذاتی خودداری اور قومی آن بان کے جذبات معرکہ آرائی کا پیام دے رہے تھے۔ اس کشاکش اور کشیدگی کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور آخر کار دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ غرور، حکومت اور ناانصافی کی قوتیں تلک کی گردن کو نہ جھکا سکیں۔ مسٹر تلک کی وطن پرستی اور قوم پرستی محض زبان داری تک محدود نہ تھی ان کی رگ رگ میں خون کے بجائے محبت کی آگ روشن تھی۔ طالب خاں علیمی کا یہ شعر ان کی ذات پر صادق آتا ہے ؎

جانم آتش تنم آتش دل جانم آتش
آب من آتش و بادآتش و خاکم آتش "

اسی طرح سے اگر وہ صبح امید کے ایڈیٹوریل لکھتے تو اس میں ایک صحافی کی مکمل شان نمایاں ہوتی تھی۔ صبح امید کے پہلے ہی شمارے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"عزیزانِ وطن اس انقلاب کے دور میں نئے خیالات کی بستی ہوئی گنگا کے ساحل پر صبح امید کی نووارد کشتی نمودار ہوتی ہے اس کے بادبان آزادی و جمہوریت کی ہوا کو اپنے دامن میں لپیٹے کے لئے تیار ہیں قوم اور ملک کی خدمت اس کا مسلک ہے۔ حبیبانِ وطن کا قبول خاص اس کا منزل مقصود ہے "

ہندوستان کے مشہور رہنما گوپال کرشن گوکھلے کی تقریروں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تو چکبست نے اس پر ایک مقدمہ لکھا۔ اس میں فرماتے ہیں :-

"ہم کو انجمن خادمانِ ہند کا مشکور ہونا چاہیئے کہ اس کی کوشش سے گوکھلے مرحوم کی چند تقریروں کا مجموعہ اردو زبان میں

شائع ہو رہا ہے۔ اُردو کی سدا بہار پھلواری میں ان پھولوں کی جگہ مدت سے خالی تھی۔ افسوس ہے تو اس قدر کہ ابھی تک اس طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ طبیعتوں کا رنگ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ دنیا کی ہل چل نے یہاں کی مُردہ طبیعتوں کو بھی بیدار کر دیا ہے۔ جو عزیزان انگریزی زبان سے واقف نہیں ان کے دلوں میں بھی قومی اور ملکی خیالات کا دریا لہریں لیتا نظر آرہا ہے......

گوکھلے مرحوم کی تقریریں زیادہ تر ان قومی ملکی اور انتظامی مسائل کے متعلق ہیں جن کی بحث اور تحریک ان کے زمانہ میں پیش آئی۔ جس قدر ملکی مسائل کی صورت بدلتی جائے گی اسی قدر ان پرانی معرکہ آرائیوں میں دل چسپی کم ہوتی جائے گی۔ لیکن عارضی مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے لئے جو مدبرانہ اصول گوکھلے مرحوم نے قائم کئے تھے ان کی وقعت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔"

یہ ہیں چکبست مرحوم کی نثر کے چند نمونے۔ ہر طرح کی نثر لکھ کر اور ہر انداز کو بیان و موضوع کے لحاظ سے پیش کر کے انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ جس رنگ کو چاہتے اختیار کر سکتے تھے اور جو کچھ انھوں نے پیش کیا ہے اس میں زبان۔ خیالات کی صفائی انداز بیان کی وجہ سے اردو ادب کے نثاروں میں نمایاں شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں۔

ان کا مضمون ذات پات کی تفریق ایک خاص انداز کا مضمون ہے اس میں حقیقی۔ تاریخی۔ اصلاحی اور ادبی رنگ یکجا ہو گئے ہیں۔ اس کے شروع میں وہ ذات کی تفریق کو سوسائٹی کی مختلف حالتوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اوّل قومی اختلاف، دوم سیاسی تفریق اور سوم پیشوں کے الگ الگ ہونے سے ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اس کے بعد یہ بیان کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ تفریق کس زمانہ سے ہوئی ہے[1]:۔

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۲۲۵

"جب قدیم زمانے میں آریا لوگوں نے ہندوستان کے
اصلی باشندے نیم مہذب وحشیوں پر حکومت کا سکہ جمایا
اسی وقت سے ذات کی تفریق کی بنیاد پڑ گئی۔ سرخ و سفید
آریا لوگ فاتح قوم کے غرور و نخوت میں ڈوبے ہوئے اپنے
محکوم سیاہ فام وحشیوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور
یہ طبیعت انسانی کا مقتضا ہے گویا یہ نیم مہذب وحشی اس
وقت کے "کالے آدمی" تھے۔ لہٰذا سب سے پیشتر اس تفرقِ
قومی سے جو کہ اختلاف قومی کا نتیجہ تھا، ذات کی تفریق کی بنیاد
پڑی۔"

قوم کی تفریق کی وجہ بتانے کے بعد وہ یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ
جب یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر بڑھتا ہی گیا آخر ان چاروں ذاتوں میں
بھی کو بتیں پھوٹیں۔ کئی صفحات پر تاریخی بحث کرنے کے بعد وہ یہ واضح
کرتے ہیں کہ لوگ ان چیزوں میں اس قدر قدامت پسند اور سخت ہیں
کہ اگر کوئی انسان اصلاحی خیالات پیش کرنا چاہتا ہے تو قوم اس کو
اپنے میں سے خارج کر دیتی ہے[۱]:-

"یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ دنیا میں جب کبھی اور جہاں
کہیں کوئی نئی بات رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے سخت اختلاف
پیش آیا ہے۔ مگر ہندوستان میں سب سے زیادہ دقت کا
سامنا ہوتا ہے کیونکہ یہاں بانیانِ اصلاح یا ریفارمروں کو
ایسی سخت سزا دی جاتی ہے کہ اصلاح کے مخالف اس سے
زیادہ سخت سزا دے نہیں سکتے اور وہ سزا اخراج قومی کی ہے
ذات سے خارج ہونے کا ڈر لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسا سمایا
ہے کہ بڑے بڑے روشن دماغ اور عالی خیال جو کہ دل سے

---

[۱] مضامین چکبست صفحہ ۳۲۹

اصلاح اور ریفارم کے حامی ہیں ذرا سی نئی بات پر عمل کرنے میں
جان چراتے ہیں "

یہ مضمون اس حیثیت سے اور اہم ہو جاتا ہے کہ خود چکبست نے ۱۹۰۸ء سے کشمیری قوم کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا اور اسی سال یہ مضمون بھی لکھا۔ غالباً جن حالات کیفیات سے ان کو دوچار ہونا پڑا اس سے متاثر ہو کر انھوں نے اس مضمون پر قلم اٹھایا یہ بات اس چیز سے اور ثابت ہو جاتی ہے کہ جب وہ تمام خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اس زمانہ کے حضرات کی بڑی بڑی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخر ان کو قوم نے کیوں نہیں خارج کر دیا تو یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے[1] :-

" اور یہ کہنا کہ قوانین ذات انسان کو ممنوعات میں دخل دینے سے روکتے ہیں، سراسر خلاف واقعات ہے ہزاروں ہندو ایسے موجود ہیں جو کہ شراب خوری اور عیاشی میں لاکھوں روپیہ تباہ کرتے ہیں یا سیکڑوں برہمن مسلمان عورتوں سے ناپاک تعلقات پیدا کرتے ہیں ہمارے بزرگ اس قسم کی بندیادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔ پھر بھی یہ باتیں چھپا کر نہیں کہی گئی ہیں، بلکہ طشت از بام ہیں۔ کون گناہوں کے مرتکب اقبالی مجرم ہیں مگر انھیں کوئی قوم سے خارج نہیں کرتا۔ ہاں اگر کوئی غیر برہمن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے کی اصلاح پیش کرے تو اس کی گردن ناانصافی کی کند چھری سے ریتنے کو سب کے سب آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حفظان اخلاق کا خیال تو بالائے طاق رکھا جاتا ہے صرف بانیان اصلاح کے خلاف جہاں اور شورشیں برپا کی جاتی ہیں وہاں خارج کرنے کا خوف بھی لایا جاتا ہے "

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۲۲۹

اس کے بعد وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ تفریق صرف ہندوستان میں نہیں دنیا میں ہر جگہ موجود ہے لیکن دوسری قومیں ہندوؤں کی طرح سخت نہیں۔ وہ ان خیالات سے بھی بحث کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان قیود سے جو ذات پات کی وجہ سے انسان پر ہیں قومی تخصیص کا اظہار مٹ جائے گا اور یہ بہانے ہیں کہ ان سے کچھ حاصل نہیں، نہ وہ اصلی حالت میں باقی ہیں اور نہ ان سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

اسی مضمون میں آگے چل کر ولایت جانے پر بھی بحث کی ہے۔ اگر اس کو غور سے دیکھا جائے تو بشن نرائن در کی ولایت سے واپسی پر جو حالات پیدا ہوئے ان کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں[1]:

"مگر ہاں کوئی ولایت کا سفر کرے اور کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، اس کی زندگی کتنی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو وہ اپنی قوم کو کتنا ہی فائدہ پہونچانے کے قابل کیوں نہ ہو مگر اس بنا پر خارج کیا جاتا ہے کہ اس نے ولایت کا سفر کیا ہے۔ کوئی اصول نہیں جس پر کہ اخراج عمل میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً فوج میں ہر سال برہمن نوکر رکھے جاتے ہیں اور ان سے قسم لی جاتی ہے کہ باہر سفر کرنے کے لئے تیار ہیں اور وہ باہر سفر کر کے ہندوستان آتے ہیں لیکن ان کو کوئی خارج نہیں کرتا ہاں اگر کوئی سویلین ہونے کے لئے ولایت جائے تو ضرور خارج کیا جاتا ہے۔ اخلاقی جعلسازی سے ذات کے قیود قائم رکھنے میں کام لیا جاتا ہے۔ میں نے سنا ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہم ولایت گئے اور ہم نے واپسی پر پانچ روپیہ دے کر پرائشچت کر لی۔ یہ پرائشچت نہیں ہے یہ توہین ہے۔ ہندو مذہب کی اور ذلت ہے ان کے لئے جو اس میں حصہ لیتے ہیں۔"

اور آخر میں وہ کہتے ہیں کہ اب اعلیٰ تعلیم ہی ان فرقوں کو مٹا دے گی لیکن جب

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۱۴۱

یہ مٹیں گے اس وقت ایک زبردست ہلچل مچ جائے گا جو وقتی ہوگا اور اس کا اخیر امن و امان پر ہوگا اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ذات پات کی تفریق کے مٹنے کا زمانہ اب آ گیا۔ اس مضمون سے زیادہ اقتباس اس لئے دیے گئے کہ اس سے ان کے اس اصلاحی جذبہ کی نمائندگی بھی ہوتی ہے جس کا ذکر ان کی شاعری کے سلسلہ میں بار بار آیا ہے۔

بچھمی رام سرور۔ پنڈت ترجھون ناتھ سپرو۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ پنڈت لبش نرائن در آبرو وہ حضرات ہیں جن کی تصنیفات زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوتی جا رہی ہیں۔ چکبست نے ان حضرات کا تعارف کرا کے گویا قالب مردہ میں از سر نو جان ڈال دی۔ اسی طرح سے منشی سجاد حسین۔ مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد۔ سرسوتی اور دادا بھائی وغیرہ کا حال پیش کر کے ان کو جاوداں زندگی عطا کی۔ ان حضرات کے خاندانی حالات۔ والد کا نام۔ جائے پیدائش۔ معاشرت۔ اور ادب کی خدمات کا جائزہ لے کر ان کو مکمل طور پر روشناس کیا ہے۔ مثلاً منشی سجاد حسین کے خاندان کا حال بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں[1]:-

"ایک خوش حال و عالی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد منشی منصور علی صاحب عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مامور تھے۔ اور بعد پنشن کے ایک عرصہ تک حیدر آباد میں سول جج رہے۔ آپ کے ماموں نواب فدا حسین خاں صاحب جو لکھنؤ کے ایک معزز وکیل تھے۔ حیدر آباد میں بعہدۂ چیف جسٹس ممتاز تھے اور ریاست میں آپ کا بہت اچھا رسوخ تھا۔ منشی سجاد حسین کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر تک زیر نگرانی نواب فدا حسین صاحب لکھنؤ میں تعلیم پاتے رہے"

اس کے بعد ان کی تعلیم۔ نوکری اور ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہیں اور آخر میں ان

---

[1] مضامین چکبست صفحہ ۲۳۱

کے چند ایسے دوستوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے ان کے متعلق معلومات حاصل کی جا سکیں۔ ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادیب نقاد تنقید کے صحیح اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے کسی کے ادبی کارناموں کا جائزہ لے رہا ہے۔ ان مضامین کا جائزہ لینے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ ان کی انشا پردازی ... اُردو انشا پردازی کے بہترین نمونے ہونے کے ساتھ ساتھ مغربی خیالات اور مشرقی طرز تحریر کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے۔ اپنے حُسن بیان کی لطافتوں کی وجہ سے ان کے زیادہ تر حصے ادب عالیہ کے زمرہ میں آجاتے ہیں۔ چکبست نے اکثر اپنی نثر میں تشبیہات و استعارات سے مدد لے کر آزاد مرحوم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ جس کی بہترین مثال ان کے تاریخ کے مضمون سے لی جا سکتی ہے[۵]:-

"قصہ مختصر عالم تاریخ کی سیر بھی عجیب روحانی سرود کا سرمایہ بہم پہونچاتی ہے اور آئینۂ عقل کو جلا دیتی ہے، اس عالم میں قدم رکھتے ہی تجربہ کا آفتاب نور افشاں نظر آتا ہے جس سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ اس عالم میں تہذیب و ترقی کی زبردست شاہراہ نظر آتی ہے جس کا ایک کنارہ ازل ہے دوسرا ابد۔ جس کی منزل پر فیض کے چشمے جاری ہیں۔ کہیں وہ لوگ خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں جنھوں نے مذہب و فلسفہ کی تحقیق میں اپنی عمر صرف کر دی ہے اور طبع نورانی سے ایسے چراغ روشن کر گئے ہیں جنھیں ہوائے مخالف کے جھونکے نہیں بجھا سکتے اور جن کی روشنی میں اب تک بہت سے گمراہ منزل مقصود تک پہونچ جاتے ہیں۔ کہیں وہ بزم جاد و آراستہ نظر آتی ہے جس میں بڑے بڑے معجز نگاروں۔ نثاروں اور شاعروں کا مجمع ہے۔ نکتہ سنجیوں کے گلدستے مہک

۵ؔ مضامین چکبست صفحہ ۳۲۴

رہے ہیں اور شراب سخن کا دور چل رہا ہے۔ کہیں ان قوی ہیکل۔ ضیغم منش نوجوان کی پُر رعب صورتیں دکھائی دیتی ہیں جن کے چہروں سے شجاعت کا نور برس رہا ہے۔ اور جن کی تلوار کے پانی سے اب تک مختلف قوموں کے اعزاز و وقار کا چمن ہرا ہو رہا ہے۔ اسی طرح عالم تاریخ میں ہر علم و فن کے باکمال حضرات کی زیارت کا موقع ملتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص عظیم الشان انسانوں کی صحبت میں بلا تکلف شریک ہو سکتا ہے اور اپنی قابلیت کے مطابق فیض حاصل کر سکتا ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے یہ مولانا محمد حسین آزاد کی طرز کی ایک اچھی مثال نہیں ہے؟ وہی تشبیہات و استعارات۔ وہی انداز، وہی روانی۔ وہی سحر بیانی۔ وہی رنگین عبارت جس نے آزاد کو نثر اُردو کے میدان میں سب سے بلند جگہ عطا کی ان کے یہاں جلوہ گر ہے۔

ڈراما

چکبست نے ایک ڈراما بھی لکھا ہے جس کا نام کملا ہے یہ ۱۹۱۵ء
میں جی۔پی۔ورما برادران پریس نظیر آباد لکھنؤ سے پنڈت کشن پرشاد کول کے
اہتمام میں شائع ہوا تھا۔

چکبست کے ادبی مرتبہ کے بڑھانے یا گھٹانے میں اس ڈرامہ کا کیا درجہ
ہے۔اس پر غور کرنے سے پہلے یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ اردو ادب کی تاریخ
میں چکبست کو اس ڈرامے سے نہیں بلکہ ان کے شاعرانہ کارناموں کی وجہ
سے اہمیت حاصل ہے۔تاہم اس ڈرامے پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا۔
ڈرامے کا قصہ مختصراً یوں بیان کیا جاتا ہے۔

ٹھاکر صاحب ایک اوسط درجے کے بے پڑھے لکھے زمیندار ہیں
اپنے لڑکے سورج سنگھ کو اس کے پرنسپل اور ماموں کے کہنے پر ولایت تعلیم
حاصل کرنے بھیجتے ہیں۔سورج سنگھ نو برس ولایت رہنے کے بعد بیرسٹر ہوکر
واپس آتے ہیں۔اس پر مغربی تہذیب کا اس قدر اثر ہے کہ وہ ہندوستان کی
کسی چیز کو بھی پسند نہیں کرتا۔ولایت کی واپسی پر جاہل ماں "کوسلا"
شادی شدہ بہن "بملا" غیر شادی شدہ بہن "کملا" اور بہنوئی چیت سنگھ
سب سے ذرا ذرا سی بات پر تھینک یو (شکریہ ادا کرنا) کہتا ہے۔سورج سنگھ
ولایت سے شراب اور گھوڑ دوڑ کی لت ڈال کر واپس ہوا ہے۔ہندوستان
میں ان کے چند دوست ہیں جن سے ولایت میں ملاقات ہوئی جو سب کے
سب شراب اور کباب کے عادی ہیں۔سورج سنگھ پر ولایت کا اثر اس حد
تک ہے کہ وہ اپنے نوکر کو "کالا آدمی" کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور ساتھ ہی

اس کو گھر کی ہر چیز میں بدبو معلوم ہوتی ہے۔ آخر باپ اور بیٹے میں اختلاف پیدا ہوتے ہوئے بات چیت تک بند ہو جاتی ہے۔

جیت سنگھ ایک ہوشیار آدمی ہے جس کی نظر ٹھاکر صاحب کی جائداد اور روپیہ پر ہے اس وجہ سے وہ ایک شخص گجراج سنگھ سے کملا کی شادی کرانا چاہتا ہے۔ گجراج سنگھ خود ایک اوباش انسان ہے اور اسی وجہ سے اپنا روپیہ برباد کر کے اب اس حالت پر آ گیا ہے کہ گھر کے زیورات بکنے لگے ہیں وہ خود ٹھاکر صاحب کے روپیہ کی فکر میں ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح کملا سے اس کی شادی ہو جائے تو اس کا کام چلے اسی وجہ سے وہ جیت سنگھ سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر جیت سنگھ اس کی شادی کملا سے کرا دے گا تو وہ جیت سنگھ کو جو روپیہ ٹھاکر صاحب شادی میں دیں گے اس کا آدھا دے دے گا۔ دوسری طرف اجیت سنگھ ایک شریف زمیندار ہے اس سے ٹھاکر صاحب کملا کی شادی کرنا چاہتے ہیں سورج سنگھ بھی اس کو پسند کرتا ہے اور اسی کے کہنے سے ٹھاکر صاحب اپنی رضامندی لکھ کر اجیت سنگھ کو بھیج دیتے ہیں۔

جیت سنگھ، ٹھاکر صاحب اور سورج سنگھ میں سخت اختلاف پیدا کراتا ہے اور نوبت یہ آتی ہے کہ ٹھاکر صاحب چند یوم کے لئے اپنے دیہات چلے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جیت سنگھ سورج سنگھ کو اجیت سنگھ کے بلانے کی رائے دیتا ہے۔ اجیت سنگھ بُلایا جاتا ہے۔ جیت سنگھ اجیت سنگھ کو دوسرے دن پھر بُلاتا ہے۔ ادھر اس بیچ میں وہ سورج سنگھ سے غلط بیانی کرتا ہے کہ اجیت سنگھ کملا سے ملنا چاہتا ہے۔ سورج سنگھ جو انگریزی طریقہ کا دلدادہ ہے وہ اس میں کوئی عیب نہیں خیال کرتا اور جب اجیت سنگھ دوسرے دن آتا ہے تو سورج سنگھ دھوکے سے کملا کو بلا کر اس کا سامنا اجیت سنگھ سے کرا دیتا ہے۔ اجیت سنگھ اپنی ایک تصویر سورج کو دیتا ہے اور جیت سنگھ، اجیت سنگھ سے ایک تصویر مانگ لیتا ہے۔ سورج سنگھ بھی کملا کی ایک تصویر اجیت سنگھ کو دیتا ہے۔ جیت سنگھ موقع سے تصویر

کملا کے پاس ڈال کر چلا جاتا ہے جو باغ میں موجود ہوتی ہے۔ کملا اس تصویر کو اٹھا لیتی ہے۔ ادھر سورج سنگھ اجیت سنگھ سے طے کر لیتا ہے کہ نہ تو اجیت سنگھ برات لائے اور نہ جہیز لے گا۔

جب ٹھاکر صاحب واپس تشریف لاتے ہیں تو جیت سنگھ تمام حال ان سے کہہ دیتا ہے کہ سورج سنگھ نے طے کر لیا ہے کہ برات نہ آئے اور جہیز نہ دیا جائے۔ ہندوستانی رسوم کے مطابق یہ چیز بہت قابل اعتراض تھی۔ ٹھاکر صاحب اس سے بے حد ناراض ہو جاتے ہیں اور نتیجہ میں باپ بیٹے میں سخت بحث ہوتی ہے اور آخر سورج سنگھ ناراض ہو کر گھر سے چلا جاتا ہے۔

جیت سنگھ ایک طرف تو ہمدرد بنا ہے لیکن اصل میں آستین کا سانپ ہے اب وہ ایک طرف تو ٹھاکر صاحب کو ابھارتا ہے اور ساتھ ہی ان سے کہتا ہے کہ کملا نے اجیت سنگھ سے تصویر بدلی ہے۔ ٹھاکر صاحب کے لئے یہ بیحد سخت بات تھی۔ وہ حد سے زیادہ ناراض ہو گئے اور کملا کو بلا کر مار ڈالنے پر تیار ہوئے آخر اسی جیت سنگھ کے کہنے پر ٹھاکر صاحب کا غصہ کچھ کم ہوا لیکن وہ کملا کو گھر میں رکھنے پر تیار نہ ہوئے وہ کملا کو پتریا (رنڈی) کہتے ہیں۔ کملا گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چمپا اس کی سہیلی اس کے ساتھ جاتی ہے۔ چمپا پہلے کملا کو روکنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کے انکار پر اپنے گاؤں جو وہاں سے دس کوس پر ہے اس کو چلنے کے لئے راضی کر لیتی ہے۔

دونوں موہن پور کے لئے روانہ ہوتی ہیں راستہ میں جنگل پڑتا ہے۔ اس میں راستہ بھول جاتی ہیں اور آخر ایک سادھو کی کٹی میں رات گذارنی پڑتی ہے۔ صبح سادھو ان کو موہن پور پہنچا دیتا ہے۔ دوسری طرف ٹھاکر صاحب اجیت سنگھ کو تار سے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اب شادی نہ کر سکیں گے۔ کملا موہن پور پہنچ کر بے حد خاموش رہتی ہے۔ اسے صرف اجیت سنگھ کا خیال ہے، یہاں وہ ایک سنیاسی کی زندگی گذارنے لگتی ہے۔

ٹھاکر صاحب ان واقعات کو برداشت نہ کر سکے اور کچھ دنوں کے بعد ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ جیت سنگھ کو سادھو سے پتا چلتا ہے کہ چمپا اور

کملا موہن پور میں ہیں اور دوسری طرف بملا سے پتا چلتا ہے کہ ٹھاکر صاحب اپنا مکان اور ایک لاکھ روپیہ اپنی بیوی کے نام لکھ گئے ہیں جو کملا کی تلاش میں ہے کہ اگر وہ مل جائے تو وہ اس روپیہ اور مکان کملا کو دے۔

جیت سنگھ موہن پور اپنے ایک دوست دلجیت سنگھ کے ساتھ جاتا ہے وہاں کملا سے ملاقات ہوتی ہے کملا اب بھی اجیت سنگھ کی محبت میں سرشار ہے اور اسے اپنا ہونے والا شوہر خیال کرتی ہے۔ جیت سنگھ پہلے کملا سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے اس کے بعد ایک دم سے ٹھاکر صاحب کے انتقال کی خبر دیتا ہے اور ساتھ ہی اجیت سنگھ کے انتقال کو بھی بتا کر کہتا ہے کہ اب تمھاری ماں اور بہن نے طے کیا ہے کہ تمھاری شادی گجراج سنگھ سے کریں۔ کملا اس سانحہ کو برداشت نہیں کر پاتی اور اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ جیت سنگھ یہاں بھی کامیاب ہوتا ہے اور کملا کو چھوڑ کر دلجیت سنگھ کے ساتھ گاؤں واپس جاتا ہے راستہ میں جب جنگل سے گذر رہا ہوتا ہے تو پیاس معلوم ہوتی ہے۔ دلجیت سنگھ پانی لاتا ہے اور جیت سنگھ جوتا اتار کر جیسے ہی پانی پینا چاہتا ہے کوئی سانپ اس کو کاٹ لیتا ہے۔ دلجیت سنگھ کی کوشش کے باوجود وہ نہیں بچ پاتا اور مر جاتا ہے۔ مرتے وقت اس کو اپنے تمام کرتوت یاد آتے ہیں۔

اس کے بعد دلجیت سنگھ گاؤں واپس جاتا ہے تاکہ بملا اور اس کی ماں کوسلا کو اس کی اطلاع دے۔ بملا جس پر پہلے ہی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا تھا، اس سانحہ سے بے حد متاثر ہوتی ہے۔ رونے دھونے کے بعد تینوں جنگل کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں لاش ان کے انتظار میں رکھی ہے۔ بملا کے رونے کی آواز سن کر سادھو آ جاتا ہے۔ وہ دلجیت سنگھ سے لکڑی چنواتا ہے، چتا تیار ہو جاتی ہے بملا روتے ہوئے شوہر کی چتا کو آگ دیتی ہے۔ جیت سنگھ کی لاش جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف کملا جس کا دماغ خراب ہو چکا ہے چمپا کے ساتھ دریا کے کنارے آتی ہے۔ چمپا سے اپنی شادی کی بات کرتی ہے کہ اب اس کی شادی ہو گی۔ ساتھ ہی اجیت سنگھ کی تصویر نکالتی ہے، اس کو پیار کرتی ہے اور ایک دم سے دریا

میں کود جاتی ہے، چمپا چیختی ہی رہ جاتی ہے۔ دریا میں دوسری طرف سے بملا اس کی ماں۔ دیجیت سنگھ اور سادھو ایک ناؤ سے آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو کملا کو ڈوبتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بے بسی میں رونے لگتے ہیں۔"

چکبست کا یہ ڈراما ان کی تصانیف میں سب سے کمزور تصنیف ہے۔ یہ ڈراما ایک اوسط درجے کے ٹھاکر زمیندار کا ہے جو دیہات میں رہتا ہے۔ جسے شہر کے سماج سے کوئی تعلق نہیں۔ چکبست نہ زمیندار تھے، نہ دیہات میں رہے اس طرح کی معلومات ان کو اپنے پیشہ کی وجہ سے حاصل ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ڈراما میں ان کا مشاہدہ کمزور اور حقیقت سے بعید ہے۔

ڈراما کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اسٹیج کیا جا سکے۔ جب ڈراما بے حد لمبا ہو جاتا ہے تو وہ اپنا یہ مقصد کھو بیٹھتا ہے۔ چکبست کا یہ ڈراما ۱۲۲ صفحات کا ہے۔ جس کو اگر اسٹیج کیا جائے تو کسی صورت میں بھی پانچ گھنٹے سے کم وقت نہ لگے گا۔ اتنی دیر نہ تو ڈراما دیکھنے والے رک سکتے ہیں اور نہ ایکٹر کام کر سکتے ہیں۔ اس میں بعض حصوں کو بلا وجہ طول دیا گیا ہے جس سے یہ اس قدر لمبا ہو گیا۔

ڈراما لکھنے والے کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ کسی ایسے مسئلے پر لکھتا ہے جس میں متصادم نظریات اور خیالات ہوں یا کوئی پیچیدہ مسئلہ ہو۔ جس کو وہ ایکٹروں کے کردار سے سلجھائے۔ چکبست کا ڈراما کسی خاص مقصد کی ترجمانی نہیں کرتا ہے۔ ہاں اگر اصلاحی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تین مقصد قرار دیے جا سکتے ہیں۔

اس ڈرامے کے ذریعہ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مغربی اثرات اور خاص طور پر مغربی خیالات جب حدود سے بڑھ جائیں تو وہ کسی حالت میں بھی مشرقی زندگی کے ہم آواز نہیں ہو سکتے۔ ان سے مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہوں گی جو اس کی تباہی کا باعث ہوں گی اس کے واسطے وہ سورج کو لیتے ہیں جو نو سال ولایت کی تعلیم حاصل کر کے واپس ہوا ہے لیکن مغربی اثرات حد سے زیادہ اس کو متاثر کر چکے ہیں اور وہ اب ہر چیز میں بے حد آزادی پسند کرتا ہے۔ وہ

لڑکی کی شادی میں جہیز دینے کا قائل نہیں۔ وہ لڑکی اور لڑکے کو شادی کے قبل ملوا دینا ضروری خیال کرتا ہے۔ یہ سب انگریزی سوسائٹی کے اثرات ہیں۔ چوتھے ہی سین میں جہاں سورج سنگھ پہلی مرتبہ سامنے آتا ہے اسی وقت سے اس کے یہ اثرات اور تبدیلیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔

(سورج سنگھ گاڑی سے اترتا ہے ٹھاکر صاحب گلے ملنے کے ارادے سے بڑھتے ہیں، طوعاً وکرہاً گلے ملتا ہے)۔

چیت سنگھ :۔ (سورج سنگھ سے) بھیا سلام۔

سورج سنگھ :۔ ہیلو چیت سنگھ گڈ ایوننگ۔

ٹھاکر صاحب :۔ (سورج سنگھ سے) بھیا اسباب وسباب دیکھ لیو۔ گٹھری مٹھری درجا ماں نہ چھوٹ جائے۔

سورج سنگھ :۔ (حیرت سے دیکھ کر) ول آپ فکر نہ کریں۔ سب ہو جائے گا۔ گاڑی ہے؟

چیت سنگھ :۔ آگے چلئے گاڑی کھڑی ہے۔ (قلیوں سے) صاحب کا اسباب اٹھاؤ۔

سورج سنگھ :۔ تھینک یو (شکریہ)

ایک رشتہ دار :۔ (دوسرے رشتہ دار سے) سورج سنگھ تو چینت بھی نا ہیں ہیں۔

دوسرا :۔ اپنے باپ کا چین لہن یو کیا کم آئے۔

یہ ہے سورج سنگھ سے پہلی ملاقات جس میں سورج کے اوپر انگریزی اثرات نمایاں ہو گئے ہیں۔ عزیزوں کو پہچانتا نہیں۔ گلے ملنا پسند نہیں۔ گاڑی کی فکر ہے۔ مختصر یہ سورج یہاں پر ایک صاحب بہادر معلوم ہوتا ہے۔ اب آئیے ذرا گھر پہونچنے اور ماں بہنوں سے ملاقات بھی دیکھتے چلئے۔

سورج سنگھ آگے آگے ٹھاکر صاحب اور چیت سنگھ پیچھے پیچھے داخل ہوتے ہیں۔

سورج سنگھ :۔ (چیت سنگھ سے) یہاں بجلی کی روشنی نہیں ہوتا۔

چیت سنگھ :۔ اب ہو جائے گی۔

سورج سنگھ :۔ (ماں کو دیکھ کر) گڈ ایوننگ ماما۔

کوسلا :۔ بھیا اچھے رہے۔

سورج سنگھ :۔ ہاں بہت اچھا۔ تھینک یو (شکریہ)

کوسلا :۔ آؤ بھیا گلے تو مل لے رہی۔

سورج سنگھ :۔ ول بڑا گرمی ہے۔ ہندوستان کا ملک بڑا گرم ہے۔

کملا :۔ (بملا سے) بھیا تو صاحب بہادر ہو گئے۔

بملا :۔ ہاں مونچھیں بھی منڈائے ڈالتے۔

کملا :۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی نہ تھا۔

سورج سنگھ :۔ (کملا کو دیکھ کر) ول کملا اچھا ہے۔

کملا :۔ (مسکرا کر گردن جھکا لیتی ہے) ہاں بھیا۔ تم اچھے رہے۔

سورج سنگھ :۔ ہاں اچھا رہا۔

سورج سنگھ :۔ (بملا کی طرف) بملا تم خوش ہے۔

ان اقتباسات سے سورج سنگھ کا کردار واضح ہو جاتا ہے اور یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ چکبست کا مقصد مغربی اثرات کی خرابی کو نمایاں کرنا تھا لیکن تیسرے ہی ایکٹ کے چوتھے سین میں سورج گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ڈرامہ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ جب کہ ڈرامہ پانچ ایکٹ کا ہے صرف چوتھے ایکٹ کے آٹھویں سین میں چیت سنگھ اور اس کی بیوی بملا میں بات ہوتی ہے جس میں سورج سنگھ کے متعلق چند جملے آتے ہیں۔

بملا :۔ سورج سنگھ کہاں ہیں۔

چیت سنگھ :۔ معلوم نہیں کہاں ہیں۔ سنا ہے عیسائی ہیں۔ سیلون میں کسی کرسٹین سے شادی کر لی۔

اس کے علاوہ سورج سنگھ کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور نہ مغربی اثرات کا ہی ذکر ہے۔ اس سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ چکبست کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ ڈراما کا نام انھوں نے

"کملا" رکھا ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دوسرا مقصد لڑکیوں سے متعلق ہو۔ شادی بیاہ کی بات چیت بھی ہے۔ لیکن یہ صاف نمایاں ہے کہ شادی بیاہ کے مراسم کی اصلاح مقصود نہیں۔ ہاں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں ہے وہ جیت سنگھ کی خود غرضی اور اس کو پورا کرنے کی تمام تر کوشش ہے۔ وہ گججرج سنگھ کے ساتھ شادی کرانا چاہتا ہے جو ایک نہایت ہی بدکار اور آوارہ انسان ہے اس کے مقابلہ میں ٹھاکر صاحب اور سورج سنگھ وغیرہ اجیت سنگھ کو جو ایک شریف انسان ہونے کے ساتھ ہی مالدار زمیندار ہے، پسند کرتے ہیں، لیکن جیت سنگھ کی حرکات سے اجیت سنگھ ایک آزاد پسند انسان معلوم ہونے لگتا ہے ظاہر ہے پہلی شادی کو کامیاب بنانا مقصود نہیں۔ دوسری شادی کے متعلق بھی کچھ اس طرح سے سوالات اور مشکلات پیدا کر دی جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں ایک قدامت پسند گھر میں صرف کش مکش ہی نہیں بڑھ جاتی ہے بلکہ ایک افسوس ناک انجام ہوتا ہے لیکن پھر بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

اگر "کملا" کے کردار کی روشنی میں ڈراما کو دیکھا جاتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے ان کا نظریہ رہا ہو کہ ہندو لڑکی اگر کسی شخص کو اپنا شوہر سمجھ لے تو اس کے بعد دوسرے کا خیال نہیں کرتی۔ اور اسی کو اپنا سرتاج سمجھتی رہتی ہے یہ بات تیسرے ایکٹ کے ساتویں سین سے پوری طرح پر نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں چکبست ایک خواب کے منظر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

(دریا کا کنارہ۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ چاند کا عکس دریا میں پڑ رہا ہے۔
اجیت سنگھ کملا ایک ڈونگی پر سیر کر رہے ہیں اور باتیں ہو رہی ہیں)۔

کملا:۔ جب سے تصویر دے گئے صورت نہیں دکھائی

اجیت سنگھ:۔ اور تم نے صورت دکھائی۔

کملا:۔ میں کس طرح آ سکتی تھی۔ تم تو بھیا سورج سنگھ کے پاس آ سکتے تھے۔

اجیت سنگھ:۔ دیکھو ہم آ گئے۔

کملا:۔ اب نہ معلوم کہ تم آ گئے کہ میں آ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم کہاں

میں کہاں یہ سپنا تو نہیں ہے۔

اجیت سنگھ :- اچھا سپنا ہی سہی۔ سپنے ہی میں تمھاری صورت دیکھ لی۔

کملا :- اب ہمیں نیند آتی ہے۔

اجیت سنگھ :- آؤ میرے زانو پر سو رہو۔

کملا :- ابھی یہ نہیں ہو سکتا۔

اجیت سنگھ :- کیوں ؟

کملا :- دیکھو سامنے پانی میں کنول کا پھول کھلا ہے۔ مگر پانی میں رہ کر پانی سے الگ ہے۔

اجیت سنگھ :- اس سے مطلب۔

کملا :- اسی طرح میں ابھی تمھارے ساتھ رہ کر تم سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔

اجیت سنگھ :- (ہنس کر) اچھا جیسی تمھاری خوشی ہو۔

کملا :- دیکھو ہماری تمھاری باتیں چاند سن رہا ہے۔

اجیت سنگھ :- باتیں ہی سننے کے واسطے ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔

کملا :- نہیں یہ دیکھ رہا ہے کہ ہم تم کہاں جا رہے ہیں۔

اجیت سنگھ :- اس وقت گانا سننے کو جی چاہتا ہے۔

کملا :- کس کا گانا سننے کو۔

اجیت سنگھ :- تم جانتی ہو کس کا گانا سننے کو جی چاہتا ہے۔

کملا :- اچھا سنو۔

اس کے علاوہ کملا صرف اجیت سنگھ کی تصویر اپنے پاس رکھتی ہے اور جب وہ سنیاسی ہو کر زندگی گذارتی ہے اس وقت بھی اس کو اجیت سنگھ کا خیال رہتا ہے۔ لیکن انجام دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ بھی مقصد نہیں۔ کیونکہ اگر اسی بات کی وضاحت کرنی تھی تو صاف طور پر انجام اس کو نمایاں کرتا۔

ڈراما کوئی عشقیہ روداد پیش نہیں کرتا ہے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے دراصل ڈراما میں کوئی مسئلہ حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتفاقات نے ایسی شکل اختیار کر لی جس میں تمام حضرات بے بس

ہوجاتے ہیں لیکن اصلیت میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ لکھنے والا خود ایسے طریقے پیدا کر دیتا ہے کہ یہ انجام ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کے بعد یہ تو صاف ہوجاتا ہے کہ چکبست نے کسی خاص مسئلہ کو پیش کرنا نہیں چاہا۔ یا اگر پیش کرنا چاہا تو انتہائی درجہ ناکامیابی حاصل ہوئی۔

ڈراما کی دوسری چیز پلاٹ ہے۔ کملا کا پلاٹ بھی نہایت ڈھیلا ڈھالا ہے اور بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی ڈرامانگار ڈراما کو طول دے رہا ہے۔ ڈرامہ کا پہلا ہی سین کافی لمبا ہو گیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے سین میں بھی بے حد طول ہے۔ معلوم نہیں کیوں چکبست ہر بات کی بے حد وضاحت کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ڈراما لمبا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے ایکٹ کا چھٹا سین جو گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل بالکل بے کار ہے۔ ان گیارہ صفحات میں چکبست نے صرف یہ بتانے کی کوشش کی کہ سورج سنگھ ولایت سے شراب اور کباب کا شوق پیدا کر کے واپس ہوتا ہے۔ اس کو وہ ایک آدھ صفحہ میں بھی لکھ سکتے تھے۔ اسی طرح سے اسی ایکٹ کا ساتواں سین جس میں جیت سنگھ اور مالن کے تعلقات کا بیان ہے اس سے ڈراما کو کوئی مدد نہیں ملتی۔ اسی طرح سے دوسرے ایکٹ کا چوتھا۔ پانچواں سین بالکل بیکار ہے۔ گانے ضرورت سے زیادہ لمبے کر دیے گئے ہیں۔ سورج اور جیت سنگھ۔ جیت سنگھ اور ٹھاکر صاحب کی باتوں کو ضرورت سے زیادہ حد تک طول دینے سے ڈراما بے حد بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر میں چکبست کو یہ احساس ہوتا ہے تو ایک دم سے اس کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جہاں تک وقت کا حساب ہے سارے ڈرامے سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس واقعہ کے کتنے دن کے بعد دوسرا واقعہ پیش آتا ہے۔ سارے کے سارے ڈراما میں اس چیز کا احساس ہی غائب ہے۔

جہاں تک کردار کا تعلق ہے۔ چار کردار نمایاں ہیں۔ جیت سنگھ۔ سورج سنگھ۔ ٹھاکر صاحب اور کملا۔ اجیت سنگھ اور گجراج سنگھ کے کردار کو بھی پوری طرح واضح نہیں کیا گیا ہے۔

چیت سنگھ ایک ہوشیار خود غرض آدمی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ہر شخص کو دھوکا دے کر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ پہلے ایکٹ کے تیسرے سین میں چیت سنگھ، گجراج سنگھ کو خط لکھتا ہوا پیش کیا گیا ہے جس سے اس کی حرکت کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

پیارے گجراج سنگھ۔ تسلیم۔ میرا سالا سورج سنگھ آج ولایت سے آنے والا ہے میں اس کے ملنے کے بہانہ سے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر یہاں آگیا ہوں، یہ لوگ دو ایک مہینے کے واسطے مجھے ضرور روکیں گے۔ تمھارا ذکر میرے سامنے آیا تھا۔ اجیت سنگھ سے مقابلہ ہے۔ ابھی سب باتیں طے ہونا باقی ہیں میں نے آج ہی سے کوشش شروع کر دی ہے زیادہ لکھ نہیں سکتا میری بیوی میرے پاس بیٹھی تھی۔ ابھی اسے ٹالا ہے پڑھی لکھی بیوی میں یہی شامت ہے۔ مفصل حال پھر لکھوں گا یا دس پندرہ دن میں خود تمھارے پاس آجاؤں گا۔ اپنے وعدہ پر قائم رہنا یہ خط پڑھ کر پھاڑ ڈالنا اور مجھے کوئی خط نہ بھیجنا۔ تمھارے اطمینان کے لئے یہ خط لکھ دیا کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں یہاں آگیا۔

تمھارا دوست

چیت سنگھ

چیت سنگھ کے اس خط کا ایک جملہ وضاحت طلب ہے "اپنے وعدہ پر قائم رہنا" سوال یہ ہے کہ گجراج سنگھ نے کیا وعدہ کیا ہے۔ دوسرے ایکٹ کے پہلے ہی سین میں اس کا جواب مل جاتا ہے۔ جہاں ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔

چیت سنگھ :- اجی نہیں وہ محض دل لگی میں لکھ دیا تھا۔ تمھارا اعتبار نہ کرونگا تو پھر کس کا کروں گا۔

گجراج سنگھ :- بھائی میں نے جو پہلے کہا تھا وہ اب بھی کہتا ہوں۔ کہو دستاویز لکھ دوں۔ جو چالیس پچاس ہزار روپیہ ٹھاکر صاحب کے یہاں سے ملے گا اس میں سے نصف تمھارا ہوگا۔ یوں تو اب میرے پاس ایک پھوٹی جھنجھی بھی نہیں۔ سخت مصیبت کا سامنا ہے۔

جیت سنگھ ایک طرف تو گجراج سنگھ سے روپیہ وصول کرنے کی فکر میں ہے اس لئے اس کو کملا کے حسن سے فریفتہ کر دیتا ہے۔ بات چیت کے درمیان اس کا کردار اور نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے ہی ایکٹ کے پہلے سین جیت سنگھ اور گجراج سنگھ ملتے ہیں :-

جیت سنگھ :- آس پاس کوئی اور تو نہیں ہے۔

گجراج سنگھ :- کوئی نہیں۔ کہو کیا کارروائی کی۔

جیت سنگھ :- کارروائی ابھی تک تو نہیں کی۔ مگر اب فکر میں ہوں۔ پرمیشر نے چاہا تو معاملہ پٹا نہ پڑے گا۔

گجراج سنگھ :- جب سے تمھارا خط آیا تب سے کچھ حال ہی نہ معلوم ہوا۔

جیت سنگھ :- ہاں میں نہ خط بھیج سکا نہ آ سکا۔

گجراج سنگھ :- خط تو بھیج دیا کرو۔

جیت سنگھ :- خط بھیجتے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔

گجراج سنگھ :- آخر یہ بتاؤ کہ کس حد تک معاملہ پہونچا ہے۔

جیت سنگھ :- معاملہ کیا۔ اجیت سنگھ کی ماں کو منگنی کا خط بھیج دیا گیا ہے۔

گجراج سنگھ :- (کرسی سے چونک کر) تو اب کیا ہو سکتا ہے۔

جیت سنگھ :- گھبراؤ نہیں۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمّت شرط ہے۔

گجراج سنگھ :- تم اپنی بیوی سے کہہ کر کملا کا دل اجیت سنگھ کی طرف سے پھیر دو۔ وہ کہدے کہ میں اجیت سنگھ سے شادی نہ کروں گی۔

جیت سنگھ :- اور اس کے ساتھ یہ بھی کہدے کہ گجراج سنگھ کے ساتھ شادی کروں گی۔

گجراج سنگھ :- اچھا تو یہ بتاؤ کملا صورت شکل میں کیسی ہے۔

جیت سنگھ :- بری ہے پری۔

گجراج سنگھ :- ہر مزی جان سے زیادہ خوبصورت ہے۔

چیت سنگھ ایک ہوشیار خود غرض آدمی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ہر شخص کو دھوکا دے کر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔ پہلے ایکٹ کے تیسرے سین میں چیت سنگھ، گجراج سنگھ کو خط لکھتا ہوا پیش کیا گیا ہے جس سے اس کی حرکت کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

پیارے گجراج سنگھ۔ تسلیم۔ میرا سالا سورج سنگھ آج ولایت سے آنے والا ہے میں اس کے ملنے کے بہانہ سے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر یہاں آگیا ہوں، یہ لوگ دو ایک مہینے کے واسطے مجھے ضرور روکیں گے ۔ تمھارا ذکر میرے سامنے آیا تھا۔ اجیت سنگھ سے مقابلہ ہے۔ ابھی سب باتیں طے ہونا باقی ہیں میں نے آج ہی سے کوشش شروع کر دی ہے زیادہ لکھ نہیں سکتا میری بیوی میرے پاس بیٹھی تھی۔ ابھی اسے ٹالا ہے بڑھی لکھی بیوی میں یہی شامت ہے۔ مفصل حال پھر لکھوں گا یا دس پندرہ دن میں خود تمھارے پاس آجاؤں گا۔ اپنے وعدہ پر قائم رہنا یہ خط پڑھ کر پھاڑ ڈالنا اور مجھے کوئی خط نہ بھیجنا۔ تمھارے اطمینان کے لئے یہ خط لکھ دیا کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں یہاں آگیا۔

تمھارا دوست

چیت سنگھ

چیت سنگھ کے اس خط کا ایک جملہ وضاحت طلب ہے "اپنے وعدہ پر قائم رہنا" سوال یہ ہے کہ گجراج سنگھ نے کیا وعدہ کیا ہے۔ دوسرے ایکٹ کے پہلے ہی سین میں اس کا جواب مل جاتا ہے۔ جہاں ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔

چیت سنگھ :۔ اجی نہیں وہ محض دل لگی میں لکھ دیا تھا۔ تمھارا اعتبار نہ کرونگا تو پھر کس کا کروں گا۔

گجراج سنگھ :۔ بھائی میں نے جو پہلے کہا تھا وہ اب بھی کہتا ہوں۔ کہو دستاویز لکھ دوں۔ جو چالیس پچاس ہزار روپیہ ٹھاکر صاحب کے یہاں سے ملے گا اس میں سے نصف تمھارا ہوگا۔ یوں تو اب میرے پاس ایک پھوٹی جھنجھی بھی نہیں۔ سخت مصیبت کا سامنا ہے۔

جیت سنگھ ایک طرف تو گجراج سنگھ سے روپیہ وصول کرنے کی فکر میں ہے اس لئے اس کو کملا کے حسن سے فریفتہ کر دیتا ہے۔ بات چیت کے درمیان اس کا کردار اور نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے ہی ایکٹ کے پہلے سین جیت سنگھ اور گجراج سنگھ ملتے ہیں :-

جیت سنگھ :- آس پاس کوئی اور تو نہیں ہے۔

گجراج سنگھ :- کوئی نہیں۔ کہو کیا کاروائی کی۔

جیت سنگھ :- کاروائی ابھی تک تو نہیں کی۔ مگر اب فکر میں ہوں پرمیشر نے چاہا تو معاملہ پٹا نہ پڑے گا۔

گجراج سنگھ :- جب سے تمھارا خط آیا تب سے کچھ حال ہی نہ معلوم ہوا۔

جیت سنگھ :- ہاں میں نہ خط بھیج سکا نہ آ سکا۔

گجراج سنگھ :- خط تو بھیج دیا کرو۔

جیت سنگھ :- خط بھیجتے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔

گجراج سنگھ :- آخر یہ بتاؤ کہ کس حد تک معاملہ پہونچا ہے۔

جیت سنگھ :- معاملہ کیا۔ اجیت سنگھ کی ماں کو منگنی کا خط بھیج دیا گیا ہے۔

گجراج سنگھ :- (کرسی سے چونک کر) تو اب کیا ہو سکتا ہے۔

جیت سنگھ :- گھبراؤ نہیں۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمت شرط ہے۔

گجراج سنگھ :- تم اپنی بیوی سے کہہ کر کملا کا دل اجیت سنگھ کی طرف سے پھیر دو۔ وہ کہدے کہ میں اجیت سنگھ سے شادی نہ کروں گی۔

جیت سنگھ :- اور اس کے ساتھ یہ بھی کہدے کہ گجراج سنگھ کے ساتھ شادی کروں گی۔

گجراج سنگھ :- اچھا تو یہ بتاؤ کملا صورت شکل میں کیسی ہے۔

جیت سنگھ :- پری ہے پری۔

گجراج سنگھ :- ہر مزی جان سے زیادہ خوبصورت ہے۔

جیت سنگھ :- اجی کملا کو دیکھو گے تو ہر مزی جان کو بھول جاؤ گے۔
گجراج سنگھ :- اچھا کیا مضائقہ ہر مزی جان نہ سہی کملا سہی۔
جیت سنگھ شراب کا بھی شوقین ہے لیکن وہ اس کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا مثال کے طور پر پہلے ہی ایکٹ کے چوتھے سین میں جب وہ سب اسٹیشن پر ہوتے ہیں تو جیت سنگھ ٹھاکر صاحب سے ریل کے وقت پوچھنے کے بہانہ سے جا کر شراب پیتا ہے:-
جیت سنگھ :- جاتا ہوں اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ آتا ہوں۔
(جیت سنگھ ریفرش روم میں چوری سے جاتا ہے اور ایک پگ پیتا ہے۔ بعد کو اسٹیشن ماسٹر کے پاس جاتا ہے)۔
اس کے علاوہ ایک جگہ پر اور اس کی شراب نوشی کا ذکر ہے۔ جب جیت سنگھ گجراج سنگھ کے مکان پر پہونچتا ہے وہاں دونوں شراب پیتے ہیں:-
جیت سنگھ :- سوچتا ہوں کہ پہلے تھوڑا سا (شراب کی بوتل کی طرف اشارہ کر کے) اس کا بھی آچمن کر لوں۔ پھر گلوری کھاؤں۔
گجراج سنگھ :- اس سے بہتر کیا ہے مگر ہم تو ہر مزی جان کے ہاتھ سے پیتے ہیں ابھی نہ پئیں گے۔ چاہے تم بھی جب ہی پینا۔
جیت سنگھ :- کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ بندہ آپ کی طرح سے سر بازار نہیں پیتا ہے۔
گجراج سنگھ :- اجی خدا کی جب نہیں تو پھر بندہ کی چوری۔
جیت سنگھ :- آپ ان باتوں کو جانتے نہیں۔ لائیے میں پی لوں۔ مگر یار تمھارے ہاتھ سے پئیں گے۔
گجراج سنگھ :- (بوتل سے شراب نکال کر) لیجئے صاحب لیجئے۔
جیت سنگھ :- لاؤ استاد (شراب پیتا اور بعد اس کے گلوری کھاتا ہے)

(کذا)

جیت سنگھ کی ہوشیاری کا عالم یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ خود کملا کو اجیت سنگھ کی تصویر دیتا ہے۔ سورج سنگھ کو اجیت سنگھ کی غلط تصویر پیش کرتا ہے کہ جہیز

نہیں چاہتے دوسری طرف یہ تمام باتیں ٹھاکر صاحب سے لگا دیتا ہے، لیکن اس شخص کی ہوشیاری اور مکاری اس میں بھی پوری طرح سے یوں نمایاں ہوتی ہے کہ وہ ٹھاکر صاحب کے مزاج سے واقف ہونے کی وجہ سے اس طرح کی حرکتیں کرتا ہے کہ ٹھاکر صاحب کا تمام کردار اس کے دل کی بات پوری کر دیتا ہے۔
ایک عبارت پیش کی جاتی ہے جس میں جیت سنگھ، ٹھاکر صاحب کو کملا سورج سنگھ اور اجیت سنگھ سب کے خلاف بھڑکاتا ہے:۔

جیت سنگھ :۔ آج آپ کچھ ملین معلوم ہوتے ہیں طبیعت کیسی ہے۔
ٹھاکر صاحب :۔ ارے ملین کیا۔ سسر سورج ہلکان کر ڈالن۔ اس بیٹا ہوئے سے پوچھا رہا کہ پر میشر بیٹا نہ دیت
جیت سنگھ :۔ نہیں لڑکے ہیں۔ پرسوں جب بمبئی گئے تو بہت رسیائے ہوئے تھے
ٹھاکر صاحب :۔ کچھ کہت رہین۔
جیت سنگھ :۔ کہتے کیا اول جلول بکتے تھے۔
ٹھاکر صاحب :۔ کہو تو کیا اول جلول بکت رہین۔
جیت سنگھ :۔ اب کہنے سے کیا فائدہ۔ آپ ان باتوں کا خیال نہ کیجئے۔
ٹھاکر صاحب :۔ نہیں تم گنگا کریا کہو۔
جیت سنگھ :۔ کہتے تھے اب اس گھر میں کبھی نہ آؤں گا۔
ٹھاکر صاحب :۔ ان کا ملاوت کو ہے۔ اب دہلیچ نگھیں تو مارے ڈنڈن کے بھیجا نکال دیہوں۔
جیت سنگھ :۔ اور (قہقہہ لگا کر) کہتے تھے کہ آپ پر نالش کریں گے۔
ٹھاکر صاحب :۔ نالش کا ہے کی۔ اپنے حیصہ (حصّہ) کی۔
جیت سنگھ :۔ اب میں نے یہ نہیں پوچھا کہ کس بات کی نالش کریں گے ان باتوں سے فائدہ کیا۔ کہئے آپ کو لڑائی کی کچھ خبر معلوم ہوئی۔
ٹھاکر صاحب :۔ نہیں نہیں بات ٹالو نہیں۔ بالسٹر بن آئین ہیں کانون (قانون) چھانٹت ہوئیں کہ اپنے حیصے کی نالش کرہیں

جیت سنگھ :۔ کریں دھریں گے کچھ نہیں غصہ میں بک گئے۔
ٹھاکر صاحب :۔ نا ہیں ان کو نالش کرے دیو۔ ان کا ملی گیا۔ جب سسر
ہمرے باپ مرے رہیں تو گھرماں بھونی بھانگ نہ بھی۔ یہ
سسر آٹھ لاکھ کی ریاست ہمری کمائی کی ہے ا ہیمان لن
کا حیصہ کس ہوئے سکت ہے۔ اتنا کانون ہم کا بھی
مالوم ہے۔
جیت سنگھ :۔ اجی قانون گیا کھیلنے۔ آپ بھی کیا کہتے ہیں۔ آخر آپ باپ
ہیں وہ آپ کے لڑکے ہیں۔ کہیں لاٹھی مارے سے پانی الگ
ہوتا ہے۔
ٹھاکر صاحب :۔ نا ہیں بالکل بگڑائے گوا ہے۔ کہت رہے کملا کے بیاہ میں
برات نہ ہوئے۔ سسرال والن پر بھی حکم چلیہیں۔
جیت سنگھ :۔ (نہایت سنجیدگی کے ساتھ آنکھیں نیچی کرکے) نہیں یہ تو
اجیت سنگھ نے میرے سامنے کہا تھا کہ برات نہ لائیں گے۔
ٹھاکر صاحب :۔ (تعجب کے ساتھ سیدھے ہوکر) اجیت سنگھ تم کا کہاں لے
جیت سنگھ :۔ یہیں آئے تھے۔
ٹھاکر صاحب :۔ ہم رے گھرماں۔
جیت سنگھ :۔ ہاں ہاں آپ ہی کے گھر میں دوسرے کمرے میں۔
ٹھاکر صاحب :۔ کب۔
جیت سنگھ :۔ جب آپ دیہات گئے ہوئے تھے رسوئج سنگھ بھیا نے
بلایا تھا۔
ٹھاکر صاحب :۔ کا کہت ہو۔ اجیت سنگھ تو سلطان پور میں رہت ہیں۔
جیت سنگھ :۔ بریلی میں ہاکی کھیلنے آئے تھے۔
ٹھاکر صاحب :۔ ہاکی کہکا کہت ہیں۔
جیت سنگھ :۔ انگریزی گلی ڈنڈا سمجھئے۔
ٹھاکر صاحب :۔ اچھا گلی ڈنڈا کھیلن آئے تھے تو ہم رے گھر آئے کاکن

کام رہا۔

چیت سنگھ :۔ (آنکھیں نیچی کرکے اور دبی زبان سے) یوں ہی آئے تھے۔

ٹھاکر صاحب :۔ ناہیں ہم کا سچ سچ بتاؤ کاہے آئے رہین۔

چیت سنگھ :۔ اچھا پھر کہونگا۔ اس وقت آپکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

ٹھاکر صاحب :۔ نا ہیں گنگا کریا ترنتے کہو سورج سنگھ، اجیت سنگھ کا کاہے بلائن رہے۔

چیت سنگھ :۔ (آنکھیں نیچی کرکے) کملا سے بھینٹ کرنے کو۔

ٹھاکر صاحب :۔ (غصے اور حیرت کی آواز میں) کملا سے بھینٹ کرے گا۔ ارے سسر کملا سے بھینٹ کرے گا۔

چیت سنگھ :۔ میں نے لاکھ لاکھ منع کیا مگر میری ایک نہ سنی۔

ٹھاکر صاحب :۔ اچھا کہو پھر بھوا کیا۔ کملا سے بھینٹ بھئی۔ پرکھن کا ناؤں (نام) ڈوبا۔

چیت سنگھ :۔ اب جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اپنے تئیں ہلکان نہ کیجئے۔

ٹھاکر صاحب :۔ بھیا ہماری دیہیں میں آگ لگی ہے۔ ہم کا سمجھاوتا ہیں۔ دھرتی پھاٹ جائے ہم سمائے جائی۔ سورج سنگھ سسر نے ہم کا منھ دکھائے کا بل نہ رکھا۔

چیت سنگھ :۔ کیا کیا جائے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر نہ مانا۔

ٹھاکر صاحب :۔ ہم تو کہت ہیں کملا کا کیا بھوا۔ بھینٹ کرے کی بریا سر نہ گئی۔

چیت سنگھ :۔ مجھ کو کملا کو دیکھ کے بڑا اچرج ہوتا ہے۔ سورج سنگھ بھیا تو ولایت ہو آئے ہیں اس کو بلا ولایت جائے انگریزی سما گئی۔

ٹھاکر صاحب :۔ اور بوڑھا کا مرگئی رہیں وہ کچھو نہ بولیں۔

چیت سنگھ :۔ بوڑھا بیچاری کس گنتی میں ہیں ان کی سنتا کون ہے وہ بیٹھی رہتی ہیں اور کملا اجیت سنگھ کی تصویر صندوقچہ سے

نکال نکال کر دیکھا کرتی ہے۔

ٹھاکر صاحب :۔ اجیت سنگھ کی تسبیر (تصویر)۔

جیت سنگھ :۔ ہاں اجیت سنگھ کی تصویر۔

ٹھاکر صاحب :۔ کملا کہاں سے پائن۔ کا وہ بھینٹ کرے کی بریا تصویر بھی دے گئے۔

جیت سنگھ :۔ شاید کملا نے مانگ لی ہو۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔

ٹھاکر صاحب :۔ (سر پر دونوں ہاتھ رکھ کر) ارے مورے رام۔ کملا سورج سنگھ کا بھی مات کر دین۔ سورج سنگھ تو بھگ گئے کملا کا ہم جندا (زندہ) دیوال (دیوار) میں چن دیب۔ ہم حویلی ماں نہ رہبے۔ گھر ماں آگ لگا کر جنگل ماں نکل جاب۔

چیت سنگھ :۔ ایسا نہ کہئے۔

ٹھاکر صاحب :۔ کملا کا تو ہم بلا رگت گرائے نہ چھوڑے۔ چاہے سسر پھانسی ہو جائے۔ بس کملا اور اپنی ساس کا ہمرے سمنے بلائے لاؤ۔

چیت سنگھ :۔ میرا نام نہ لیجئے گا۔ کیا کہوں سخت غلطی ہو گئی۔ سادھارن منھ سے بات نکل گئی۔

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد چیت سنگھ کی حرکات کا مکمل پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ٹھاکر صاحب کو ایک طرف تو سورج سنگھ سے انتہائی درجہ بدظن کر دیتا ہے اور دوسری طرف اجیت سنگھ کے خلاف ٹھاکر صاحب کے خیالات کر دیتا ہے اور ساتھ ہی کملا اور اجیت سنگھ کی غلط تصویر پیش کر کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ڈراما میں مکمل طور پر چیت سنگھ اپنی حرکت میں کامیاب ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ غالباً چیت سنگھ کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو کملا کی شادی گجراج سنگھ سے کرا کے جو رقم ٹھاکر صاحب اس کو دیں آدھی حاصل کر لی جائے اور دوسری طرف سورج سنگھ کو گھر سے نکلوا دیا جائے جس سے ٹھاکر صاحب

کی تمام جائداد کملا اور بملا کو مل جائے جس سے اس کو فائدہ ہو۔

دوسرا کردار سورج سنگھ کا ہے جو نو برس ولایت میں رہ کر واپس ہوا ہے۔ لیکن اس کے کردار کو دیکھتے ہوئے فوراً یہ پتہ چلتا ہے کہ بیحد بناوٹی ہے۔ خاص کر اس کے تمام مکالمے مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ولایت سے واپس ہوا ہے اور ہندوستانی تہذیب کو بالکل بھول گیا ہے۔ سورج سنگھ جیسے ہی گاڑی سے اُترتا ہے اسی وقت سے یہ اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ باپ کے گلے ملنے میں تکلف ہے اور ساتھ ہی ہر ہر بات میں تھینک یو (شکریہ ادا کرنا) کہتا ہے جب کہ گھر کا ماحول یہ ہے کہ ٹھاکر صاحب تک اس کو سمجھ نہیں پائے۔

سورج سنگھ :۔ تھینک یو (شکریہ) ہمارا کپڑے کا صندوق کس آدمی نے اتارا (ایک خدمت گار کی طرف دیکھ کر) ادھر دیکھو کالا آدمی۔ جلدی جاؤ اسباب لاؤ۔

کوسلا :۔ بھیا دوسر کمرہ ماں رکھائے دیا ہے۔

سورج سنگھ :۔ تھینک یو (شکریہ) سورج سنگھ دوسرے کمرے میں جاتا ہے۔

ٹھاکر صاحب :۔ (چیت سنگھ سے) سسر کچھ سڑیائے گوا ہے۔ دوئی دوئی منٹ پہ بعد ہاخ تھو ہاخ تھو کرت ہے۔

چیت سنگھ :۔ (ہنس کر) ہاخ تھو ہاخ تھو نہیں تھینک یو کہتے ہیں۔

ٹھاکر صاحب :۔ یو کا۔

چیت سنگھ :۔ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ٹھاکر صاحب :۔ کس کا۔

چیت سنگھ :۔ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ٹھاکر صاحب :۔ کس کا۔

چیت سنگھ :۔ ماں کا بہن کا۔

ٹھاکر صاحب :۔ بس دیکھ لیا۔ سسر آدمی سے بن مانس ہوئے گئے۔ بھیا ہم سے ان سے نہ نبھیہے۔

اس ماحول میں ایک بالکل مغربی اثرات سے شرابور آدمی کا گزر کس قدر

نا ممکن ہے۔ سورج سنگھ ہر طرح کی آزادی کا دلدادہ ہے۔ یہاں تک کہ بہن کو اس کے ہونے والے شوہر سے ملوانے میں اس کو کوئی اعتراض نہیں۔ کملا کو بلا کر وہ اجیت سنگھ سے صرف ملاتا ہی نہیں بلکہ کملا کی تصویر بھی اجیت سنگھ کو دیتا ہے۔ لڑکیوں سے دوستی کرنا اور اس کو بیان کرنے میں اسے بالکل ہی اعتراض نہیں۔ ہندوستان کی ہر چیز سے نفرت ہے۔ یہاں کی آب و ہوا۔ تدین انسان ہر چیز خراب نظر آتی ہے۔

سورج سنگھ :۔ ہاں ہم رات بھر نہیں سویا۔ صبح آنکھ جھپک گیا تو
دیر تک سوتا رہا۔

جیت سنگھ :۔ کیوں خیریت ہے۔

سورج سنگھ :۔ خیریت کیا۔ ہندوستان میں مچھر کا کیڑا بہت دک
(دق) کرتا ہے۔ تین رات ہو گی ہم نیند بھر نہیں سویا۔

جیت سنگھ :۔ مچھر کا کیڑا مارنے کی دوا آپ ولایت سے نہیں لایا۔

سورج سنگھ :۔ ہا ہا ہا۔ دوا کیا کر سکتا ہے۔ ہندوستان کا پانی
خراب۔ ہندوستان کی ہوا خراب۔ ہندوستان کی
مٹی خراب۔ اسی سے کیڑا پیدا ہوتا ہے۔

یہ پہلے ہی ایکٹ کے چھٹے سین میں ہے اس کے علاوہ دوسرے ایکٹ کے تیسرے سین میں بھی سورج سنگھ کی شکایت پیش کی جاتی ہے۔

بملا :۔ وہ تو ہم لوگوں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔ اماں
دس دفعہ بلاتی ہیں تو ایک مرتبہ آتے ہیں اور جب تک
بیٹھے رہتے ہیں کہتے جاتے ہیں یہاں سے بو آتی ہے۔ وہاں
سے بو آتی ہے۔

نو برس میں سورج سنگھ کس قدر بدل گیا ہے کہ اس کو ہندوستان کی ہر چیز گندی خراب اور بدبو دار نظر آتی ہے۔ وہ کثرت سے شراب کا عادی ہو کر واپس ہوا ہے اور ساتھ ہی گانا بجانا بھی عیب نہیں خیال کرتا ہے۔

جیت سنگھ :۔ کچھ Music (گانا) ضرور ہو۔

سورج سنگھ :- پہلے ہم گانا مانگتا ہے۔

اس پال :- پہلے آپ گائیے پھر ہم گائے گا۔

سورج سنگھ :- گاتا ہے۔

سورج سنگھ کی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آزادی آخر باپ بیٹے میں اختلاف پیدا کر دیتی ہے۔ سورج اپنے دوستوں سے اس کا ذکر برابر کرتا ہے۔ پہلے ایکٹ کے چھٹے سین میں اس کا ذکر پہلی مرتبہ ملتا ہے۔

سورج سنگھ :- آپ یقین مانئے۔ ہم کو آئے ہوئے تین دن ہوا ہے اور ہمارا فادر (باپ) سے ہم سے قریب قریب بول چال بند ہے۔

لیکن سورج سنگھ کی حرکات جلد ہی باپ بیٹے کے تعلقات کو بد سے بدتر کر دیتے ہیں۔ تیسرے ایکٹ کے تیسرے سین میں سورج سنگھ اور ٹھاکر صاحب سے بحث ہو جاتی ہے :-

ٹھاکر صاحب :- داہیج (جہیز) دیا چاہیے اور اجیت سنگھ کا برات لانا ہوئے۔ نہیں تو ہم سسر لڑکی کا کوئیاں میں دھکیل دیبے مگر اجیت سنگھ کے گھر نہ دیبے۔

سورج سنگھ :- آپ نے پولیٹکل اکانمی نہیں پڑھا ہے۔ ہندوستان کا روپیہ شادی بیاہ میں کس مانک لٹتا ہے اور اس سے کسی مانک کا فائدہ نہیں ہوتا ہے۔

ٹھاکر صاحب :- پھائدہ (فائدہ) لئے پھرت ہے۔ سسر پرکھن کی ریت میں پھائدہ دیکھا جات ہے۔

سورج سنگھ :- ریت بدلتا جاتا ہے اور بدلتا جائے گا۔ ہمارا پرکھا لوگ فضول خرچ تھا تو ہم ان کی ریت پر چلنا نہیں مانگتا۔

ٹھاکر صاحب :- ہم کہہ دیا ہم سے دلیل نہ ملاؤ۔ جب اپنی کمائی کا روپیہ لایو تو اس کا سیفت سنیت کے رکھو ہم کا نہ سکھاؤ۔

سورج سنگھ :- ہم آپ کا لڑکا ہے۔ آپ کے خاندان کا ممبر ہے آپ کا

فضول خرچی دیکھ کر ہمارا دل پر چوٹ لگتا ہے۔ ہم نو برس
ولایت میں تعلیم پا کر آیا ہے۔ آپ کو ہماری بات ماننا
چاہیئے۔

ٹھاکر صاحب:۔ اب ہمرا منھ نہ کھلاؤ۔ ہم کا اکل سکھاوت ہو۔ اپنے
کرتوت ناہیں دیکھت ہو۔ سسر گھوڑ دوڑیاں دوئی
ہجار روپیہ بوڑھا سے لیکر ہار آئے۔ یو کس شاستر کی
ریت ہے اس کا بلایت میں فضول خرچی نہیں کہت ہیں
کنیاں دان ماں روپیہ دینا فضول خرچی ہے۔

سورج سنگھ:۔ ول آپ بالکل (UNCIVILIZED) ان
سول لائز ہے آپ نہیں جانتا کہ گھوڑ دوڑ میں جوا کھیلنا
کلچر کی بات ہے۔ ولایت کا بڑا بڑا لوگ گھوڑ دوڑ میں
جوا کھیلتا ہے۔

ٹھاکر صاحب:۔ ہم کا سسر انگریزی ماں بُرا بھلا کہیو تو ہم تمھار
کھپڑی توڑ دیبے سسر بلایت۔

سورج سنگھ:۔ ول آپ کا (TONE) ٹون برا (INSULTING)
انسلٹنگ ہے۔ آپ بالکل (UNCONSTITINAL)
ان کانسٹیٹیوشنل ہے۔ ہم زیادہ توہین نہ برداشت کریگا۔

کوسلا:۔ (سورج سنگھ سے) بھیا تمھیں چُھپائے رہو۔ بڑن سے بھڑے
کا نہ چاہی۔ پھر کبھی سمجھایو۔

سورج سنگھ:۔ ول ہم یہ توہین نہیں برداشت کر سکتا۔ آپ
(ٹھاکر صاحب کی طرف) ہم سے معافی مانگنے نہیں تو ہم
ایکشن (ACTION) لے گا۔

ٹھاکر صاحب:۔ (غصّے میں اٹھ کر اور لاٹھی تان کر) سسر ہم تم سے مانی
منگبے۔ ہمرے سامنے سے ہٹت ہو کہ ناہیں۔ ابھی مارے
ڈنڈن کے چرسا نکال دیہوں۔ سسر بلایت گوا کہ

بن مانس بن آوا۔

کوسلا :۔ (بیچ میں آکر) جائے دیو۔ جائے دیو۔ لڑکا ائیں (کذا)

(چیت سنگھ داخل ہوتا ہے اور سورج سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے جاتا ہے)

چیت سنگھ :۔ آئیے آپ میرے ساتھ آئیے۔ اس وقت ٹھاکر صاحب بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔

سورج سنگھ :۔ بڈھا بالکل وحشی (BRUTE) ہے۔ اب اس گھر میں ہم نہیں رہ سکتا۔ ہم ابھی جاتا ہے۔

چیت سنگھ :۔ نہیں ایسا نہ کیجئے۔ بزرگ ہیں خفا ہوتے ہیں۔ موقع سے سمجھا دیجئے گا۔ سمجھ جائیں گے۔

سورج سنگھ :۔ ہم ایسی بزرگی کو ٹھوکر مارتا ہے۔ ہم اس بڈھے کو ٹھیک بنا دے گا۔ ہم (ازالہ حیثیت عرفی) ڈفرامیشن کی نالش کریگا۔

ہم ابھی جاتا ہے۔ ہم ایک منٹ بھی اس گھر میں نہیں ٹھہر سکتا ہے (چوکیدار کو پکارتا ہے) چوکیدار گاڑی لاؤ۔

آج سورج سنگھ گھر چھوڑ کر بمبئی جاتے اور وہاں سے سیلون جا کر مذہب عیسائی اختیار کر لیتے ہیں۔ سورج سنگھ کا کردار ایک مغربی تہذیب کے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے دلدادہ انسان کا کردار ہے جو کسی بھی حالت سے مشرقی ماحول کے اندر ٹھیک نہیں ہو پاتا ہے۔

ٹھاکر صاحب ایک زمیندار اکھڑ آدمی ہیں۔ پرانے طرح کے زمیندار ہیں تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ غصہ حد سے زیادہ ہے۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے۔ مشرقی تہذیب کے مطابق گھر کے بڑے بوڑھے ہونے کی وجہ سے اور گھر کے مالک کی وجہ سے ہر چیز میں اپنا ہی اثر رکھنا چاہتے ہیں۔ ٹھاکر ہیں اس وجہ سے بات بات پر ڈنڈا یا تلوار سیدھی کرتے ہیں چیت سنگھ کے چرکوں میں آسانی سے آجاتے ہیں، اور اپنا گھر برباد کر کے خود انتقال فرما جاتے ہیں۔

کملا جو در اصل قصبہ کی جان ہے ایک خالص مشرقی تہذیب کی لڑکی کی

حیثیت سے پیش کی جاتی ہے۔ جوان۔ شریف اور شرمیلی لڑکی ہے۔ تعلیم کا کچھ پتا نہیں، مذہب کی پابند ہے۔ شرمیلی اور حیادار ہے۔ جب اجیت سنگھ سے سامنا ہوتا ہے تو فوراً شرما کر واپس آجاتی ہے۔ جب جیت سنگھ، اجیت سنگھ کی تصویر دیتا ہے تو شرما جاتی ہے۔ لیکن ایک شخص کو اپنے شوہر ہونے کی حیثیت سے دیکھنے کے بعد سے اس کے تصوّر سے سرشار ہوتی ہے، اس سے محبت کرتی ہے۔ تیسرے ایکٹ کے چوتھے سین میں جب چمپا کملا کی سہیلی کملا کو گانے کے لئے مجبور کرتی ہے اس وقت اس محبت کا مکمل طور پر احساس ہوتا ہے۔

کملا :۔ میں تو سکھی پریم دیوانی مورا درد نہ جانے کوئے

چمپا :۔ میں تو جانتی ہوں (مسکراتی ہے)۔

کملا :۔ میں تو سکھی پریم دیوانی مورا درد نہ جانے کوئے
گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے

درد کی ماری بن بن ڈولوں بید ملے نہ کوئے
مجھ پاپن کی پیر مٹے جب بید سنوریا ہوئے
گھڑی ایک چین نہ آئے تم درشن بن موئے
تم ہی میرے پران پیا ہو کیسے جیون ہوئے

دھان نہ بھاوے نیند نہ آوے برہا ستاوے موئے
گھائل سی گھومت پھروں مورا درد نہ جانے کوئے
سارا دن مچھلی سی تڑپوں رین گنواؤں روئے
گھائل سی گھومت پھروں مورا درد نہ جانے کوئے

جو میں جانتی کہ پریت کئے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈھورا پیٹتی کہ پریت کرے نہ کوئے

لیکن جیسے ہی کملا کو ٹھاکر صاحب رات کے بارہ بجے گھر سے نکال دیتے ہیں ویسے ہی وہ ایک ہمّت کی دھنی اور بہادر لڑکی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ چمپا لاکھ سمجھاتی ہے لیکن وہ غیرت کی ماری کسی حالت سے بھی ٹھاکر صاحب کے باغ میں شب گزارنے کو راضی نہیں ہوتی۔ آخر چمپا کے گاؤں جانے کو راضی

ہو جاتی ہے۔ اور وہاں پہونچ کر واقعی وہ اجیت سنگھ کے عشق میں سرشار ہو کر محض سادہ زندگی گزارتی ہے۔ اس کے صحیح کردار اور استقلال کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب چمپا اپنے گھر پہونچنے کے ایک ماہ کے بعد ایک دن اس سے اجیت سنگھ کو اطلاع کرنے کو کہتی ہے۔

چمپا :۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی اپائے سے اجیت سنگھ کو تمھارے حال کی خبر کر دی جائے۔

کملا :۔ نہیں نہیں کہیں ایسا بچپن نہ کرنا۔ میرے منھ میں کالک نہ لگانا۔

چمپا :۔ میں نے اسی لئے کہا تھا کہ اس بیچارے کو خبر بھی نہ ہوگی۔

کملا :۔ نہیں اتنی خبر ضرور ہو گی کہ اب بیاہ نہ ہوگا۔ ٹھاکر صاحب نے تار ضرور بھیج دیا ہوگا۔

چمپا :۔ اس خبر سے کیا فائدہ۔ انھیں یہ تو معلوم ہو گا کہ تم نے ان کے لئے جوگ لیا ہے۔

کملا :۔ تو چاہتی ہے کہ وہ بھی سمجھیں کہ کیسی بد نصیب سے منگنی ہوئی تھی جس کو باپ نے بارہ بجے رات کو گھر سے نکال دیا۔

چمپا :۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ تدبیر تو کرنا چاہیئے۔ تمھاری عمر کس طرح پار ہو گی۔

کملا :۔ تو اس کی فکر نہ کر اب آنند ہے آنند۔

چمپا :۔ نہیں اجیت سنگھ کو ضرور تمھارا حال معلوم ہونا چاہیئے۔ شاید وہ آ جائیں۔

کملا :۔ چمپا تو اپنے ہوش میں ہے۔ کیا باتیں کرتی ہے تو مجھے کیا سمجھی ہے۔

چمپا :۔ نہیں میں نے کہا دیپک کی بہا ویں نہیں جل جل مرے پتنگ۔

کملا :۔ ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ میں پتنگ بن کر جینا چاہتی ہوں۔ دیپک بن کر نہیں۔

اس اقتباس سے ایک طرف تو کملا کے کردار کی مضبوطی کا پتا چلتا ہے تو دوسری طرف وہ یہ کہ اپنی عزت اور آبرو کو کس قدر عزیز رکھتی ہے۔ اس کا مکمل

پتا چلتا ہے ۔ لیکن جب چیت سنگھ اس پر اپنا آخری حملہ کرتا ہے ۔ یعنی اجیت سنگھ کے انتقال کی خبر دیتا ہے اور گجراج سنگھ سے شادی کا حال بتاتا ہے تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتی اور پاگل ہو جاتی ہے آخر دریا میں کود کر جان دے دیتی ہے۔

یہ خاص کردار ڈراما میں نمایاں نظر آتے ہیں ۔ اجیت سنگھ کا کردار زیادہ نمایاں نہیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھا لکھا ایک زمیندار ہے ۔ نہایت شریف ترقی یافتہ لیکن حدوں کے اندر رہنے والا انسان ہے ۔ انگریزی سوسائٹی کے باوجود شراب کباب کی لت سے الگ ہی نہیں بلکہ بے حد خلاف ہے ۔ جس دن سورج سنگھ اپنے دوستوں کے ساتھ اجیت سنگھ کو اپنے یہاں بلاتا ہے اور تمام دوست شراب کے نشے میں چور ہو چکے ہوتے ہیں تو اس حالت کو دیکھ کر چیت سنگھ اور اجیت سنگھ میں جو بات ہوتی ہے وہ اس کے کردار کا آئینہ ہے ۔

چیت سنگھ :۔ یہ تماشا آپ نے نہ دیکھا ہوگا ۔

اجیت سنگھ :۔ واقعی اچھا تعلیم کا اثر ہے ۔ مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں یہ رنگ ہے تو میں کبھی شریک بھی نہ ہوتا ۔

اس کے کردار چکبست نے زیادہ مفصل نہیں لکھا ۔

گجراج سنگھ کا کردار اور حال اجیت سنگھ کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں ہے ۔ شراب کباب کا شوقین اور ساتھ ہی طوائف کا بھی شوق ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر کا تمام سامان بکنے کی نوبت آجاتی ہے ۔ خود زمیندار تھا لیکن جو حالت ہے اس کا پتا اس کی اور چیت سنگھ کی گفتگو سے چلتا ہے ۔

چیت سنگھ :۔ اور یہ عیش کس برتے پر ہوتے ہیں ۔

گجراج سنگھ :۔ گھر کا زیور بیچ کر ۔

چیت سنگھ :۔ ہو زبردست آدمی ۔

گجراج سنگھ کی ذلیل طبیعت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ طوائف اور بیوی میں کوئی فرق نہیں کرتا ۔

گجراج سنگھ :۔ اچھا یہ بتاؤ کملا صورت شکل میں کیسی ہے ۔

چیت سنگھ :۔ پری ہے پری ۔

گجراج سنگھ :- ہرمزی جان سے زیادہ خوبصورت ہے۔
چیت سنگھ :- کیا آجکل ہرمزی جان پر عنایت ہے۔ وہی ہرمزی جان رام پور۔
والی۔ میں نے ان کو عرصہ ہوا امیر چند جوہری کے جلسہ میں دیکھا
تھا۔

گجراج سنگھ :- ہاں، ہاں، وہی ہرمزی جان۔ ابھی آتی ہوں گی۔
چیت سنگھ :- اور تمھاری پرانی آشنا جینا جان کیا ہوئیں۔
گجراج سنگھ :- کہیں ہوا کھاتی ہوں گی۔ اب تو ہرمزی جان پر جان جاتی ہے۔
چیت سنگھ :- اجی کملا کو دیکھو گے تو ہرمزی جان کو بھول جاؤ گی۔
گجراج سنگھ :- اچھا کیا مضائقہ ہے۔ ہرمزی جان نہ سہی کملا سہی۔

یہ صحیح ہے کہ گجراج سنگھ کو کملا سے زیادہ ٹھاکر صاحب کا روپیہ کملا سے شادی کرنے کا خواہش مند گئے ہوئے تھا۔ پھر بھی اس کو اس قدر تمیز نہیں کہ بیوی اور طوائف میں کیا فرق ہے۔ نہایت غیر ذمہ دار اور لاپرواہ آدمی کی حالت سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈراما کے کردار ضرور اچھے ہیں۔ ہر شخص کے کردار سے اس کی شخصیت مکمل طور پر سامنے آجاتی ہے۔ ہر شخص اپنے الگ الگ عقائد اور خیالات رکھتا ہے اور اس کی مطابقت سے اس کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چکبست نے کردار پیش کرنے میں ضرور محنت کی ہے اور کامیابی حاصل کی۔

ڈراما میں کوئی ادبی خصوصیت نہیں ہے۔ مکالمے زیادہ ترلمبے اور ضرورت سے زیادہ طویل ہوگئے ہیں۔ سورج سنگھ کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زبان بالکل بدل گئی ہے اور بعض اوقات تو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ بالکل مصنوعی ہے۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس میں بھی خامیاں ہیں۔ چکبست دیہاتی زندگی سے آشنا نہ تھے انھوں نے اپنے موکلوں سے جیسی زبان سنی تھی۔ اس کو پیش کرتے ہیں لیکن ان میں اکثر غلط الفاظ استعمال کر گئے ہیں مثلاً

(صفحہ ۶۸ پر) ٹھاکر صاحب :- ارے ملیں کیا۔ سسر سورج سنگھ ہلکان کر ڈالن۔
یہاں "گیا" کے بجائے۔ "کا" ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ دیہات میں کا ہی

بولتے ہیں۔

(صفحہ ۷۰ پر) ٹھاکر صاحب:۔ بھیا ہمری دیہیں میں آگ لگی ہے ہم کا سمجھاؤ ناہیں۔ دھرتی پھاٹ جائے ہم سما جائی۔ سورج سنگھ ہم کا منھ دکھائے کابل نہ رکھا۔

اس میں تین لفظ غلط ہیں:۔(۱) "سما" دیہاتی سمائے بولتا ہے۔

(۲) "دکھائے" دیہاتی دکھاوے بولتا ہے۔

(۳) نہ رکھا۔ دیہات میں ناہیں رکھیں بولا جاتا ہے۔

(صفحہ ۷۶ پر) ٹھاکر صاحب:۔ کاؤ میو بلائی بنی ہوئی ہیں۔

دیہات میں میوں بلائی بولا جاتا ہے۔

(" ") ٹھاکر صاحب:۔ کھول۔ ناہیں اب میں اس ضد کیچھ سے تو سر کچل ڈاہیوں۔

"ڈاہیوں" کے بجائے ڈریہوں ہونا تھا۔

(صفحہ ۷۶ پر) ٹھاکر صاحب:۔(کوسلا سے) بس اب تم نہ بولو ناہیں تو اچھی نہ بیتے۔

دیہاتی اچھی نہ بیتے نہ بولے گا بلکہ اچھا نہ ہوئی کہے گا۔

(صفحہ ۷۷ پر) کوسلا:۔ ارے مورے رام یو کا وبھوا۔ ہمرے سمجھ میں کچھ نہیں آت ہے۔

"نہیں آت ہے" صحیح نہیں، ناہیں آوت ہے ہونا چاہیئے۔

(صفحہ ۸۰ پر) ٹھاکر صاحب:۔ ارے سسر یو لڑکی نہ آئے سیتریا آئے۔ آج بلا اس اس کا رگت گرائے نہ رہبے۔

"بلا اس کا رگت گرائے" ٹھیک نہیں۔ اس کے بجائے

"بنا یہہ کا رگت گرائے" ہونا چاہیئے تھا۔

لیکن یہ خامیاں ایسی نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان کے مطلب پر کچھ اثر پڑے یا کوئی اور خرابی پیدا ہو جائے۔

احتشام صاحب فرماتے ہیں کہ ان سے اکثر کشن پرشاد کول صاحب کہا کرتے تھے کہ دیکھئے ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب جب ڈراما لکھنے پر آتا ہے تو اس کو کتنی زحمت ہوتی ہے اور آخر ناکامی۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ دراصل ۱۹۱۵ء تک ہمارے یہاں ڈراموں کا اس قدر نہ تو رواج تھا اور نہ وہ ایسا ادبی معیار رکھتے

تھے جیسے آج۔ یہ ضرور ہے۔ کہ چکبست نے شیکسپیر کے ڈرامے پڑھے تھے اور ان کو اس کے اثرات قبول کرنے چاہیئے تھے لیکن وہ نمایاں نہیں ہیں۔ اردو ادب میں آغا حشر سے قبل جو ڈرامے لکھے گئے ان کی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے احتشام صاحب فرماتے ہیں[۱]:-

"ہندوستان میں تجارتی ماحول اور سرمایہ کی پیدائش نے پارسی اسٹیج پیدا کیا۔ اس اسٹیج کی جڑ ویں ماضی میں پیوست ہونے کے بجائے مغربی اثرات سے ملی ہوئی تھیں۔ یہ اسٹیج اندر سبھا کے مقابلہ میں ترقی یافتہ تھا۔ اس اسٹیج کے لئے جو ڈرامے لکھے گئے ان کا پہلا مقصد تفریح تھا اس لئے ایسے موضوعات کی تلاش نہ تھی۔ جن سے مسائل حیات کے تاریک گوشے منور ہیں یا ملک کی سیاسی سماجی اور نفسیاتی زندگی کے بھید کھلیں بلکہ قصوں میں دلچسپی ہی اصل چیز تھی۔ سنے سنائے افسانو فرضی بہادری اور جانبازی کے کارناموں۔ مشکوک تاریخی کہانیوں کے ڈرامے اس طرح تیار کر لئے جاتے تھے کہ وہ اسٹیج پر دکھلائے جاسکیں شیکسپیر اور دوسرے ڈراما نگاروں کے ڈراموں میں کاٹ چھانٹ کر کے انھیں اپنے ڈھب کا بنا لیا جاتا تھا۔ یہ صورتِ حال انیسویں صدی کے آخری بیس سال سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سال تک رائج رہی"۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں چکبست ڈراما لکھتے ہیں لیکن کسی کمپنی کے لئے نہیں بلکہ محض ڈراما لکھنے کا خیال۔ ڈراما میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کسی خاص موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر اس پر بحث کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور نہ الجھے ہوئے واقعات کو سلجھانے کی کوشش کی گئی۔ بہر کیف چکبست نے صرف یہ ایک ڈراما لکھا اور اس کے بعد انھوں نے اس صنف پر قلم نہ اٹھایا۔ تاہم چونکہ یہ چکبست کی ادبی کاوش تھی اس لئے اس کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ ورنہ اس

---

[۱] کتاب "ادب اور سماج" از سید احتشام حسین۔ پبلشر کتب پبلشرز۔ لمیٹڈ بمبئی اکتوبر ۱۹۴۸ء۔ مضمون "جدید اردو ڈراما"۔

کے مطالعہ سے چکبست کی ادبی یا شاعرانہ اہمیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔
چکبست کے مضامین نثر کا مطالعہ کم سے کم ایک بات تو ثابت ہی کر دیتا ہے کہ چکبست صرف شاعر نہیں تھے بلکہ زبان و ادب کے رمز شناس اور اصول تنقید کے اچھے جاننے والے بھی تھے۔ ان کا مدلل اور سنجیدہ انداز بیان تنقید میں ایک طرح کی سنجیدگی، بلندیٔ نگاہ، صحیح ذوق سخن اور معیار کی تلاش کا پتا دیتا ہے تو دوسری طرف سیاسی اور علمی مضامین میں گہری سوجھ بوجھ جذبۂ اصلاح و آزادی اور نکتہ سنجی کا اظہار کرتا ہے۔ گویا چکبست کو چاہے ہم ایک صاحب نثر نگار نہ کہہ سکیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کا ادبی معیار بلند ہے اور ان کی نثر نگاری۔ واقعیت اور حقیقت سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ایک خوشگوار اثر چھوڑتی ہے۔ ان کی تحریر میں کسی طرح کی بناوٹ یا بیجا لفاظی کا پتا نہیں چلتا ہے۔ یہ بات ان کے ڈرامے کے لئے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ، جیسا کہ کہا جا چکا ان کا ڈراما، ڈرامے کی بہت سی خوبیوں سے خالی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں چکبست کی اس نثر نگاری کا حسن بھی جلوہ گر نہیں ہے۔ جو ان کے دوسرے نثری مضامین میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ اس طرح چکبست کا کوئی مطالعہ ان کی نثر کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ شاعری محض جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے اور نثر ٹھوس اور مدلل انداز سے لکھنے والے کی شخصیت کو نمایاں کرتی ہے۔ چکبست کی نثر و نظم میں بھی یہ باتیں دیکھی جا سکتی ہیں اور ہم بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف لکھنؤ کے ادب میں بلکہ سارے اُردو ادب میں چکبست کی نثر اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور اگر انھیں اس کی طرف زیادہ توجہ کرنے کا موقع ملتا تو یقیناً اُردو ادب کی تاریخ میں ایک اعلیٰ پائے کے نثر نگار کا اضافہ ہو جاتا۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ چکبست کا ذکر عام طور سے شاعر ہی کی حیثیت سے کیا کیا جاتا ہے اور ان کی نثر نگاری پر وہ توجہ نہیں کی جاتی جس کے وہ مستحق ہیں۔

چکبست کا ادبی مقام

گذشتہ اوراق پر نظر کرنے سے چکبست کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے فن اور خیالات کے ان پہلوؤں پر بھی نظر ڈال لی جائے جو گذشتہ صفحات میں کسی وجہ سے جگہ نہیں پاسکے یا جن پر غور کرنے سے اُردو ادب میں ان کا مقام متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس سلسلہ میں جہاں چکبست کی ادبی اور فنی خصوصیات ہمارے پیش نظر ہوں گی وہاں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جائے گی کہ انھیں جو "پیامبر دورِ جدید" کہا گیا ہے یا جنگِ آزادی کا پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے اس کی کیا نوعیت ہے۔ اس مسئلہ پر پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اپنے مضمون "چکبست پیامبر دورِ جدید" میں بڑی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے اور تقریباً ہر پہلو کی وضاحت کردی ہے لیکن اس میں چکبست ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ میں اس موقع پر ان کی ادبی حیثیت اور پیامبری دونوں کے امتزاج سے ایک نقطۂ نظر قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اگر ایک طرف ہندوستانی حکومت کا خاتمہ کردیا تو دوسری طرف ادیبوں میں یہ شعور پیدا کردیا کہ وہ شاعری کو زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کریں حالات کے بدل جانے کی وجہ سے قومی اور وطنی تصوّر دلوں میں بیدار ہونے لگا اور اس قومی تصوّر نے آگے بڑھ کر وطنی بیداری کا احساس پیدا کردیا جس کے نتیجہ میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ چکبست ذہنی اعتبار سے اس دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ احتشام صاحب فرماتے ہیں[۱]:۔

---

[۱] تنقیدی جائزے۔ احتشام حسین صاحب صفحہ ۱۲۳

"ان کا دَور وہی قومی اور وطنی بیداری کے احساس کا دَور ہے جو غدر کے کچھ عرصہ بعد کانگریس کا بھیس بدل کر اُٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتا گیا۔ انیسویں صدی جاتے جاتے ہمیں ایک مبہم سا قومی تصوّر دیتی گئی اور چکبست اس دَور کی پیداوار ہیں۔ تقریباً ۱۹۱۷ء تک ہندوستانی بیداری کا یہی پیام رہا کہ ہم میں وطن کی محبت پیدا ہو۔ وطن سے محبت کرنے والوں سے محبت پیدا ہو۔ ہندوستان کو ایک قومی حیثیت دی جائے اور انتظام ملکی میں ہندوستان کا بھی ہاتھ ہو۔"

گزشتہ ابواب میں ان باتوں کو تفصیل سے پیش کیا جا چکا ہے، پھر دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ چکبست اس ہندوستان کے شاعر تھے جو سیاسی حیثیت سے بیدار تو ہو چکا تھا، لیکن جس کا آزادی کا تصوّر ناقص اور محدود تھا۔ اس وقت کے تاریخی تقاضوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ اقدام بھی ترقی پسند تھا، لیکن بعد کے سیاسی ارتقا کی روشنی میں اس کی حیثیت وہ نہیں نظر آتی جس نے ہندوستان کو آزادی سے ہم کنار کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی کوئی بڑی ذمّہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے تھے غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو ان کو روسی انقلاب کی بھیانک تصویریں دکھائی جا رہی تھیں اور دوسری جانب ان کے دماغ میں یہ سوال پیدا کیا جا رہا تھا کہ تم جاہل اور غیر ترقی یافتہ ہو حکومت تمھارے بس کی چیز نہیں۔

اقبال نے شروع بیسویں صدی میں یورپ اور ولایت کا چکّر لگا کر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا، جس کے نتیجہ میں ان کے خیالات نے "خضر" بن کر "بندۂ مزدور" کو پیام دیا کہ ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

مگر چکبست کی آنکھیں اتنی روشن نہ تھیں۔ انھوں نے دنیا کی عام ترقی پسند تحریکوں سے ہندوستان کے لئے کوئی بلند تر پیام تلاش نہیں کیا۔ دراصل چکبست

عملی سیاست میں اتنا دخل نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان کی آواز تھی جو سیاسی رہنماؤں اور رہبروں کے پیام کی شکل میں سنی جا رہی تھی۔

حالیؔ اُردو کے پہلے شاعر کہے جا سکتے ہیں جو ہندوستانیوں کی تباہی اور بربادحالی پر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی گذشتہ عظمت یاد دلا کر ان کو عزت دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وجہ سے انھیں کبھی کبھی قوم کا مرثیہ خواں بھی کہا گیا ہے۔ اکبرؔ الہ آبادی بھی مشرق کے مٹتے ہوئے وقار پر نوحہ کناں ہیں: حالیؔ۔ اکبرؔ کی طرح حال سے بیزار نہیں ہیں اور اس معاملہ میں چکبستؔ حالیؔ ہی کے ہم نوا قرار دیے جا سکتے۔ شاید یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ چکبستؔ کا سیاسی شعور حالیؔ کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور متعین تھا۔ چکبستؔ کو جب زندگی کا شعور ہوا اس وقت محض ماضی کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے چکبستؔ نے کچھ آگے بھی دیکھا، بقول احتشام صاحب[1]:

> ”ہندوستان اپنی گذشتہ عظمتوں کی یاد دل میں لئے ہوئے بیٹھا تھا اور چکبستؔ اس کے ماضی اور حال کا مقابلہ کر رہے تھے، اسے ان بزرگوں کی یاد دلا رہے تھے جن کی عظمتوں کا راز ہمالیہ کے سینہ میں پوشیدہ تھا اور پھر ہندوستان کو وسیع ترقی پر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی شاعرانہ نگاہ کو ہندوستان ”لاش بے کفن“ نظر آ رہا تھا اور ۱۹۰۵ء میں ”صور حب قومی“ کو پکارتے تھے کہ وہ ہندوستان کو خواب سے جگا دے انقلاب کی آواز ان کے کانوں میں بھی گونج رہی تھی لیکن صاف نہ تھی۔“

لیکن ان کا یہ پیغام صرف ہندوستانی رہنماؤں کے عام جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ وہ خود کوئی ”مفکر“ نہ تھے۔ اُن کی شاعری کا پیغام وطن پرستی۔ آزادیٔ خیال۔ قومیت کا ایک مبہم تصور اور معاشرتی اصلاح کا پیغام تھا۔ وہ ہندوستان میں نئے اُفق اور نئے آفتاب کا جلوہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان سیاسی

---

[1] تنقیدی جائزے   احتشام حسین صاحب   صفحہ ۱۲۷

تقاضوں کا نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے ہوم رول کے لئے جد و جہد شروع کی۔ یعنی ایک طرف تو وہ برطانیہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ دوسری طرف ان سے عوام کی شکایتوں کا ذکر بھی دبی زبان سے کرتے جاتے ہیں۔ وہ اسی خیال میں سرشار اور سرمست تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہوم رول مل جائے تو یہی ہندوستان کے لئے باعثِ نجات ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کا یقین بھی تھا کہ اگر ہندوستانیوں میں اتحاد پیدا ہو جائے تو انگریز خود ہندوستان کو حقوق دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت وہ مختلف شکلوں میں اس اتحاد کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک جگہ شاعرانہ انداز میں اسے بڑے خوبصورت الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

رقیب کہتے ہیں رنگِ وطن نہیں یکساں — بنا ہے قوس قزح خاکِ ہند کا داماں
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں — نہ ایک رنگِ طبیعت نہ ایک رنگ زباں

جو ہوم رول پہ یہ چشمِ شوق شیدا ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

یہی ہوم رول ان کا نعرہ تھا اور اسی کو انھوں نے اپنے سیاسی شعور کا مقصد قرار دیا ؎

وطن پرست شہیدوں کی لاش لائیں گے — ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کیلئے درد دکھ اٹھائیں گے — یہی پیامِ وفا قوم کو سنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ممکن ہے آج آزاد ہندوستان میں ہوم رول کا نام اچھا نہ معلوم ہو۔ لیکن جس زمانہ کا یہ ذکر ہے۔ اس زمانہ میں یہی خیالات انقلاب پسندانہ کہلاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دو چار جگہ انھوں نے سلطنت برطانیہ کے لئے نہایت سخت الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر اس کی وجہ وہ صدمہ ہے۔ جو کسی رہبر قوم کے اٹھ جانے سے پیدا ہوا ہے۔ تلک کی موت پر غیر ملکی حکومت کو "رقیب" اور "بندۂ رسمِ جفا" کہا ہے۔ اسی طرح جلیانوالہ باغ کے حادثہ سے متاثر ہو کر

کہتے ہیں ؎

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

غرض کہ چکبست کا سیاسی شعور، جس میں حب وطن۔ آزادیٔ رائے۔ قومی اتحاد اور ایک محدود قسم کے جذبۂ آزادی کی آمیزش ہے۔ شاعری کے پردے میں ظاہر ہو کر اردو شاعری کا ایک اہم اور عزیز سرمایہ بن گیا۔ ان کی شاعری تبلیغی ہوتے ہوئے بھی خلوص کی شدت کی وجہ سے بلند پایہ رکھتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی۔ اکبر اور اقبال کے علاوہ وہی اس عہد کے ایسے شاعر ہیں جن کے قلم سے ملک میں بیداری کا صور پھونکا اور ادیبوں کی قومی اور ملکی خدمت کے لئے کمربستہ کیا۔ ان کی یہ حیثیت ایسی ہے جس کا اعتراف بہت سے نامور نقادوں نے کیا ہے اور بہت سے اصحاب فکر نے اس کے لئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اگر انھوں نے محض سیاسی اور قومی تصورات کو نظم میں پیش کر دیا ہوتا تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بڑائی یہ ہے کہ ان کا کلام بیک وقت شاعری کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے اور قومی بیداری کا پیام بھی۔

چکبست کی شاعری ایک طرف تو ان کے سیاسی تصورات کی آئینہ دار ہے دوسری طرف اودھ کی تہذیب۔ لطافت اور نفاست کے اثرات اپنے اندر رکھتی ہے۔ انھوں نے آتش کے صوفیانہ خیالات رندی۔ آزادی پسندی۔ اور انیس کی سحر کاریوں سے متاثر ہو کر اپنے کلام کو ایک نئی راہ دکھائی۔

ان کو زبان پر مکمل طور پر قدرت حاصل ہے وہ خشک سے خشک مسائل کو بالعموم شگفتہ اور لطیف پیرائے میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی زبان عام طور سے غلطیوں سے مبرا ہے۔ زبان کی صحت، اسلوب اور طرز ادا کے لئے لکھنؤ کا نام اکثر لیا جاتا رہا ہے اور یہ درست بھی ہے کہ عام طور سے لکھنؤ کے شاعر و ادیب استعمال الفاظ و محاورہ میں صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ چکبست کے یہاں یہ خصوصیت بھی نمایاں ہے۔ زیادہ تر نقادوں

نے ان کی زبان کو مستند قرار دیا ہے۔ لیکن ایک زمانہ میں یہ بحث بھی اُٹھی تھی کہ چکبست نے زبان و بیان کی غلطیاں کی ہیں۔ اس کا تذکرہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ رسالہ الناظر اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مولوی محمد یحییٰ تنہا کا ایک مضمون چکبست پر شائع ہوا جس میں فاضل مضمون نگار نے ان کی زبان پر چند اعتراضات کئے ہیں جن کا تجزیہ یہاں کر دیا جائے تاکہ ان کی نوعیت واضح ہو جائے۔

اعتراض :۔ "نذرانۂ روح یا مرشد کی محبت" کے عنوان سے آپ نے پنڈت لبھن نرائن در کے انتقال کے بعد ایک نظم لکھی ہے جو آپ کے مجموعۂ کلام کا سرنامہ ہے۔ پہلا ہی بند ہے ؎

دل پر درد کے ٹکڑے جو کئے ہیں یک جا
تیرے قدموں کے لئے تھا یہی میرا تحفا
مگر افسوس کہ یہ دین ادا ہو نہ سکا
اب سر لوح پہ ہے نقش یہ پیغام وفا
میرے سودائے طبیعت کا جو افسانہ ہے
مرنے والے یہ تیری روح کا نذرانہ ہے

شائد یہی ان اشعار کا مطلب ہے کہ تیرے فراق میں جو دل پر درد شکستہ ہو گیا تھا اس کے ٹکڑے اس لیئے جمع کئے ہیں کہ تیرے قدموں پر نثار کروں کیونکہ میں یہی تحفہ پیش کر سکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ میں اس قرض کو ادا نہیں کر سکا اور اب میری جبیں پر یہ پیغام وفا نقش ہے یعنی میری طبیعت میں جو سودا سما گیا اور جس کا چرچا ہو رہا ہے وہ ہی تیری روح کا نذرانہ ہے۔

یہ مطلب ہم نے ان اشعار سے نہایت غور کے بعد نکالا ہے ورنہ سیدھی طرح سے یہ مطلب نہیں نکلتا کیونکہ دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کے دل پر درد کے ٹکڑوں

کو تحفہ کہا گیا ہے اور تیسرے مصرع میں یہ تحفہ دین یعنی قرض بن گیا
جس سے بے ربطی کلام ظاہر ہوتی ہے۔ چوتھے مصرع میں سر لوح سے لوحِ
مزار مراد ہے یا اپنی جبیں اور پیغامِ وفا معلوم نہیں مرنے والے کا
پیغامِ وفا ہے یا شاعر کا پیغامِ وفا اپنی قوم کے لئے ہے یا مرنے
والے کے لئے جو اس کی جبیں پر نقش ہے اور وہ پیغامِ وفا کیا ہے؟
سودائے طبیعت ہے۔ اس کو اظہارِ وفا کہیں یا شاعر کی زبان میں
پیغامِ وفا۔ الغرض عجیب الفاظ میں یہ نذرانۂ روح پیش کیا گیا
ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں کچھ مضامین جوش زن
ہیں لیکن وہ ان کو خوبی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا۔"

جو شخص بھی اردو شاعری کے مزاج سے واقف ہے اور لفظوں کے شاعرانہ استعمال کا اندازہ کر سکتا ہے اسے کسی حالت میں چکبست کا مطلب سمجھنے میں دشواری نہیں ہو سکتی ہے چکبست کا مقصد صرف اتنا ہے کہ میری دلی خواہش تھی کہ میرا جو سب سے قیمتی سرمایہ یعنی مجموعہ کلام ہے وہ بشن نرائن در کی زندگی میں تحفہ کے طور پر ان کی خدمت میں پیش کروں لیکن بد قسمتی سے میری یہ آرزو پوری ہونے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا اور اب میں ان کی یاد میں انھیں کے نام کو اس مجموعۂ کلام کا عنوان بناتا ہوں اور اس کی روح کے سامنے یہ نذرانہ پیش کر سکتا ہوں اس کے سوا کوئی دوسرا مطلب نکالنا یا استعمال ان الفاظ میں کسی قسم کی الجھن محسوس کرنا معمولی سے معمولی مبصر کو بھی حیرت میں ڈال دے گا۔

اعتراض: "آپ نے بعض جگہ غلط بھی استعمال کئے ہیں مثلاً

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی
نگاہِ شوق کو ہے دورِ نو کی مشتاقی

لفظ مشتاقی غلط استعمال کیا گیا ہے۔"

اگر محض سند کی ضرورت ہو اور یہ دیکھنا ہو کہ اردو یا فارسی شاعری "مشتاقی" کا لفظ کہیں اور بھی استعمال ہوا ہے تو صرف حسب ذیل شعر

کافی ہوگا۔

بر پایاں آمد ایں دفترِ حیات ہم چناں باقی
بصد دفتر نہ شاید گفت حسب الحال مشتاقی

لیکن اس کے علاوہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اسم فاعل سے اس طرح الفاظ بنا لینا فارسی اور اردو دونوں میں عام ہے اور عاشقی کا لفظ تو اس قدر مشتمل رہا ہے کہ اس کی مثال دینے کی ضرورت بھی نہیں اگر عاشقی کی ترکیب درست ہے تو مشتاقی کے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں :۔

اعتراض :۔ "اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"
"گماں کو شک کے معنی میں استعمال کیا ہے جو اس موقع پر ہمارے روزمرّہ کے خلاف ہے ہم یہاں شبہہ یا شک ضرور استعمال کریں گے۔ لیکن گمان ہرگز استعمال نہ کریں گے"

آتش کا ایک شعر ہے ؎

دہن پر ہیں اس کے گماں کیسے کیسے
خیال آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

یہاں پر بھی گمان شک کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب تنہا صاحب اگر آتش کے کلام کو بھی مستند نہ خیال کریں تو اور کچھ کہنا فضول ہے۔

اعتراض :۔ بیش نرائن در۔ توحید میں ایک مصرع ہے ع
"آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا"
انسان ہونا آدمی کی معراج ہے، ہونا چاہیئے جیسا کہ جگر مراد آبادی کا مصرع ہے ع
"یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے"
اسی نظم میں عیاں کا قافیہ چھپاں باندھا ہے۔ حالانکہ لفظ چھپاؤں ہے چھپاں نہیں ہے"

یہ اعتراض عام بول چال اور محاورے کے لحاظ سے کچھ زیادہ غلط نہیں ہے لیکن معنوی حیثیت سے اس طرح اظہار خیال میں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔ "انسان

ہونا آدمی کی معراج ہے" اور "آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا" دونوں معنی کے اعتبار سے یکساں ہیں۔

اعتراض:۔ "وطن کا راگ" اس نظم میں ایک مصرع ہے۔ ع
'خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے'

قید کا گوشہ بے معنی ہے قید خانہ کا گوشہ ہونا چاہیئے۔

قید کا لفظ شعراء کے یہاں قید خانہ کے معنی میں برابر استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی یہی صورت ہے ؎

قید میں یعقوب نے گو لی نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

اعتراض:۔ "کیا کہوں کون ہوا سر میں بھری رہتی ہے
بے پیے آٹھ پہر بے خبری رہتی ہے
اس موقع پر کون ہوا غیر فصیح ہے کیا ہوا ہونا چاہیئے تھا"

فصیح اور غیر فصیح کا معیار ذوقِ سلیم ہے۔ اہلِ زبان کا بولنا ہر طرح سے فصیح سمجھا جاتا ہے۔ کون اور کیا دونوں بولے جاتے ہیں اور غالباً "کیسی" کا لفظ کون اور کیا دونوں سے بہتر ہوتا

اعتراض:۔ "دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے موروں کی نوا
نوا کا دل میں پیوست ہونا نہ کوئی محاورہ ہے اور نہ روزمرہ ہے
لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ موروں کی نوا دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے"

یہاں پر نوا کو تیر سے تشبیہ دے کر تیر کو نظم میں کیا ہے محض پیوست سے اشارہ کر دیا ہے۔ اس کو روزمرہ یا محاورہ سے کوئی تعلق نہیں۔

اعتراض:۔

"ایک یا دو نوحوں کو چھوڑ کر آپ نے جس قدر نوحے محبان وطن کے لکھے ہیں شعر کے اندر ان کا نام نہیں آیا۔ اگر عنوان نہ لکھا جاتا تو یہ پتہ بھی نہ چلتا کہ آپ نے کس کا نوحہ لکھا ہے ان کے صفات عام طریقہ پر بیان کر دیے ہیں جو دوسروں میں بھی پائے جاتے ہیں

اور ان سے کوئی خصوصیت نہیں رکھتے"۔

اس اعتراض کی تفصیلی بحث "نوحے" کے باب میں آچکی ہے۔ یہاں پر صرف پروفیسر مسعود حسین ادیب کا خیال پیش کیا جاتا ہے[1]۔

"مجھے ان کی اس بے امتیازی پر حیرت ہے۔ کیا کوئی صاحب امتیاز گوکھلے کے مرثیے کو تلک کا اور تلک کے مرثیے کو گوکھلے کا قرار دے سکتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی جو وقعت چکبست کے دل میں تھی وہ ان کی پبلک زندگی اور قومی خدمات کی بنا پر تھی۔ اور ان دونوں کے مرثیوں سے بھی یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے نامور بیرسٹر پنڈت بشن نرائن در ایک عالم۔ فاضل۔ انشا پرداز۔ شاعر۔ ادیب۔ نقاد۔ وطن پرست اور ماہر سیاسیات تھے۔ مگر چکبست کے ان کمالات سے کہیں زیادہ ان کے اخلاق اور انسانیت کے گرویدہ تھے۔ ان کے مرثیے سے بھی یہی ظاہر ہو رہا ہے"۔

ظاہر ہے کہ چکبست نے شاعری تو کی لیکن اس پر جتنے ریاض کی ضرورت تھی وہ ان کے امکان میں نہ تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ اگر وہ اپنے کلام پر زیادہ غور و خوض کرتے تو بعض خامیوں کو دور کر سکتے تھے۔ یا اشعار کو زیادہ چست اور رواں بنا سکتے تھے لیکن انھیں اس کا خاطر خواہ موقع نہیں ملتا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم تحریر فرماتے ہیں[2]۔

"چکبست شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے مگر ان وکالت کا آسرا لینا پڑا جس کی وجہ سے وہ اپنا پورا وقت ادب کی خدمت میں وقف نہ کر سکے۔ اپنے نجی خطوط میں انھوں نے بارہا اس امر کی شکایت کی کہ قانونی مشاغل اور شاعری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ "یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی دشمن ہیں پھر آپ ہی فرمایئے آگ، پانی کو ایک جگہ کیونکر جمع کروں"۔

---

[1] مضمون پنڈت برج نرائن از مسعود حسن رضوی۔ یادگار چکبست صفحہ ۵۴

[2] چکبست بحیثیت مصلح وطن پرست۔ یادگار چکبست مرتبہ آنند نرائن ملا صفحہ ۱۱۳

اُنھوں نے اُردو شاعری کا نظر غائر سے مطالعہ کیا تھا اور اسی پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے اس عہد کے مسلم الثبوت زبان داں شاعر حضرت فضل لکھنوی سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ گویا انھوں نے اس بات کی خاص کوشش کی تھی کہ زبان کو صحت کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ یوں تو وہ بھی انسان تھے ممکن ہے کہیں پر غلطی ہوگئی ہو۔ ان کی زبان کے متعلق سر تیج بہادر سپرو نے صبح وطن کے دیباچہ میں فرمایا ہے :-

"چکبست کا ادبی مذاق خاص الخاص لکھنوی ہے لفظوں کی سبکی اور گرانی سختی اور نرمی۔ سوقیت اور ثقاہت ان کی صوتی اور معنوی صحت۔ محاورے کی درستی اور ان کا برمحل استعمال مترادفات کا نازک فرق۔ عروضی اور صرفی و نحوی قواعد کی پابندی ان سب چیزوں کا لحاظ رکھنا لکھنؤ کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت چکبست کے یہاں پورے طور پر موجود ہے"

انھوں نے اپنے انداز خاص میں گل ہائے رنگا رنگ پیش کیے ہیں۔ ادب اُردو میں بعض ہندی تلمیحات کا بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

تیری آنکھوں میں اگر دُور ہوا پاکی نقاب دیکھ پھر کیا نظر آتے ہیں عزیز اور احباب
بیوفاؤں کی مروت میں نہ کر عمر خراب حق پرستوں کی امانت ہے ترا زور شباب
دھرم پر جو نہ فدا ہو وہ جوانی کیا ہے
دودھ کی دھار ہے تلوار کا پانی کیا ہے

اب نہ ارجن نہ وہ گیان کا دریا باقی نہ وہ آنکھیں نہ وہ نور کا جلوہ باقی
دل لبھانے کو ہے دنیا کا تماشا باقی درد باقی ہے نہ ہے درد کا شیدا باقی
بانسری لے کے نیا راگ سُنا دے کوئی
سو رہا ہے دلِ مایوس جگا دے کوئی

اور ساتھ ہی ہندوستانی بزرگوں کے تذکرے کیئے ہیں۔ خاص کر گوتم۔ ارجن۔ بھیشم۔ رانا دغیرہ مثلاً فریاد قوم میں فرماتے ہیں ؎

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار پکارتے ہیں مدد کے لئے در و دیوار

وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار　　زمین ہلتی ہے اُڑتا ہے خون بن کے غبار
جگہ سے اپنی ہے چتوڑ کی زمیں سرکی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندو و ہشیار　　اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار　　تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

انھوں نے عام سیاسی و سماجی اصلاحات کو جو اب تک اُردو میں استعمال نہ ہوئی تھیں اپنے کلام میں اضافہ کیا ہے مثلاً سوراج۔ ہوم رول سنتری وغیرہ ہوم رول کا لفظ ان کے کلام میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ایک مثال پیش کی جاتی ہے ؎

زمین ہند کی رتبہ میں عرش اعلیٰ ہے　　یہ ہوم رول کی اُمید کا اُجالا ہے
مسز بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے　　فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

لفظ سنتری بھی دو ایک جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ؎

پہنانے والے اگر بیڑیاں پنہائیں گے　　خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے
جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے　　یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

مروجہ فارسی الفاظ کا استعمال بھی ان کے یہاں کم نہیں اور جو ہے وہ بڑی خوبصورتی نطافت اور فن کاری کے ساتھ ہے۔

اس ساری بحث میں چکبست کی منظر نگاری کی طرف توجہ نہیں کی جا سکی کیونکہ صرف چند لفظوں اور غزل کے چند اشعار میں اس کی طرف توجہ کی گئی ہے تاہم انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر چکبست نے اس طرف توجہ کی ہوتی تو

وہ شاعری کے اس پہلو کو بھی ایک بلند منزل تک پہونچا سکتے تھے۔ اردو کے
قدیم شعراء یا مرثیہ نگاروں کے علاوہ درگا سہائے سرور، مہاراج بہادر برق
جگت موہن لال رواں اور بعض دوسرے شعراء نے فطرت کے حسین مرقعے پیش
کئے ہیں۔ چکبست کی بعض نظموں کے اقتباس یہ ظاہر کریں گے کہ چکبست کو
مناظر فطرت کے پیش کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔

سیر دہرہ دون ان کی منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے اس کے چند
اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہے ہریالی

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا
بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں
پہاڑ اسکو چھپائے ہیں اپنے دامن میں

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمہ آب

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

اسی طرح سے "آصف الدولہ کے امام باڑہ" کو دیکھ کر وہ اس قدر متاثر
ہوتے ہیں کہ شب کے منظر کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے لگتے ہیں ؎

دیکھ سیاح اسے رات کے سناٹے میں
منہ سے اپنے مہ کامل نے جب الٹی ہو نقاب

در و دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک
سحر کرتی ہے نگاہوں پہ ضیائے مہتاب

یہی ہوتا ہے گماں خاک سے مس اسکو نہیں
ہے سنبھالے ہوئے دامن میں ہوائے شاداب

یک بیک دیدۂ حیراں کو یہ شک ہوتا ہے
ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اتر آیا ہے سحاب

بیخودی کہتی ہے آیا یہ فضا میں کیونکر
کسی استاد مصور کا ہے یہ جلوۂ خواب

اک عجب منظر دلگیر نظر آتا ہے
دور سے عالم تصویر نظر آتا ہے

ان کی شروع کی نظموں میں جو جوش و خروش اور ولولہ ہے وہ آخیر میں
آہستہ آہستہ مدھم ہوتا جاتا ہے غالباً اس کی وجہ عمر اور پیشہ کی مصروفیات ہوں
حب وطن سے سرشار چکبست ہر وقت اور ہر جگہ وطن اور وطن کے لوگوں سے

سرمست نظر آتے ہیں اکثر الفاظ اسی جذبہ کی وجہ سے اتنی مرتبہ استعمال کئے ہیں کہ وہ تکیہ کلام معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً "ہم مرہٹوں" "غریب قوم" ان کے کلام کا درد و اثر۔ الفاظ کی رنگینی اور اشعار میں جوش و خروش ان کو ادب اُردو میں ایک خاص بلند مقام پر لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ انکے زمانہ کی حالت کا اگر مکمل طور پر اور واضح طور پر جائزہ لینا ہو تو ان کی شاعری اس کا آئینہ ہوگی۔ اس لئے چکبست اپنے دور کے صفِ اوّل کے شعراء میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ان کے قدرشناسوں کی تحریروں سے چند اہم اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ مجموعی طور پر چکبست کے متعلق نقادانِ فن کی کیا رائے ہے۔

بابائے اُردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب ارشاد فرماتے ہیں[۱]:-

"زورِ بیان اور فصاحتِ زبان کے ساتھ خلوص و درد بھی ہے وہ ملک کی بے بسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ اور اس حال میں جو کچھ کہتا ہے اس کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ آزادی کا دلدادہ ہے مگر بے لگامی کا روادار نہیں۔ وہ سچا لبرل ہے اور اس رستے پر چلنے والا ہے جو بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہے جس کا دوسرا نام اعتدال ہے۔ لوگ اعتدال پر ہنستے ہیں اسلئے کہ وہ اس پر چل نہیں سکتے۔ وہ انگریزی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے، مگر یورپ کا اندھا مقلد نہیں۔ وہ اپنے ملک کی معاشرت اور رسم و رواج سے خوب واقف ہے، اور ان کے عیب چن چن کر دکھاتا ہے لیکن وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ نئے خیالات کی رو میں ہماری خوبیاں بھی بہہ جائیں۔ وہ جذباتِ انسانی سے گہری واقفیت رکھتا تھا، اور بعض اوقات نازک جذبات کو موقع پر بڑی خوبی اور حسن سے ادا کر جاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ بھی معمولی نہیں۔ وہ حقیقت اور واقعیت کو خوبصورت تشبیہوں

---

[۱] ادب اُردو اور چکبست۔ یادگار چکبست۔ مرتبہ آنند نرائن ملا صفحہ ۹

اور استعاروں میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ تصویر کھنچ جاتی ہے۔
اور یہ سب باتیں اس زبان میں فصاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے
جو ہماری تہذیب اور یک جہتی کی سب سے بڑی اور قابل قدر
یادگار ہے اور آئندہ بھی آپس کے اتحاد میں کارگر ثابت ہوگی۔ اس
نے اپنے کلام سے اُردو زبان کا رُتبہ بڑھا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی
اُردو ادب میں ایک جگہ قائم کر دی۔ بلا شبہ اس کا شمار ہمارے
اساتذہ میں ہے۔"

نیاز صاحب فتح پوری فرماتے ہیں[۱]:—

"آپ کا سارا کلام پڑھ جائیے، کسی ایک جگہ بھی کوئی
رکیک جذبہ یا لفظ نظر نہ آئے گا اور یہ خصوصیت چکبست کی اس
انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔ جس میں کوئی لکھنوی شاعر ان کا شریک
نہیں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

قدرداں کیوں مجھے تکلیف سخن دیتے ہیں
میں سخنور نہیں، شاعر نہیں استاد نہیں

لیکن یہ ان کا انکسار شاعرانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ
سخنور بھی تھے، شاعر بھی تھے استاد بھی تھے"

جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی فرماتے ہیں[۲]:—

"چکبست کا کلام اس کے کردار کا آئینہ ہے۔ انتہائی غیرت
اور خودداری کے باوجود کبر و نخوت کا شائبہ نہیں، انتہائی سوز و
گداز و خستگی کے باوصف یاس و حرماں کی افسردگی ہے نہ محرومی کی فریاد
وزاری، کلام انتہائی جوش و خروش کے ہوتے مبالغے سے پاک
اور حقیقت سے ہمکنار ہے، شدید جذبہ حب وطن طاری ہے۔ یہ
بھی دیکھ رہے ہیں کہ بھائی کا خون بھائی بیمانہ بیدردی سے بہا رہا ہے

---

[۱] چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے۔ یادگار چکبست۔ مرتبہ آنند نرائن ملا صفحہ ۲۳
[۲] چکبست کی شاعری " " " " " " " ۳۱۰

مگر کیا مجال کہ لہجے میں درشتی یا انداز بیان میں تلخی پیدا ہو (یہ ہے عالی ظرفی) بے شمار اچھوتے خیال نظم ہوئے مگر سب زبان کی حدوں میں اور کہیں نام کو گنجلک نہیں۔ ثقیل و نا مانوس الفاظ و تراکیب کا ذکر ہی کیا جو بدقسمتی سے آجکل کی شاعری کا طغرائے امتیاز بنے ہوئے ہیں۔"

پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی فرماتے ہیں[۵] :-

"لفظوں کی سبکی اور گرانی، سختی اور نرمی، سوقیت اور ثقاہت، ان کی صوتی اور معنوی صحت، محاوروں کی درستی اور ان کا برمحل استعمال، مترادفات کا نازک فرق، عروضی اور صرفی و نحوی قواعد کی پابندی، ان سب چیزوں کا لحاظ رکھنا لکھنؤ کی شاعری کی خاص خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت چکبست کے یہاں پورے طور پر موجود ہے۔ اور کیوں نہ ہوتی؟ وہ خود اہل زبان تھے۔ اہل زبان اور اہل ادب کے ہم نشین تھے۔ انھوں نے آتش اور انیس کے سے ماہر صناعوں کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور انکے اسلوب بیان کے دلدادہ تھے .... اردو کی قدیم شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے کہ جس میں الفاظ کی صناعی کا کمال موجود ہے۔ مگر نفس مضمون کچھ بھی نہیں۔ جدید شاعری میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جنمیں نفس مضمون تو بہت اچھا ہے مگر شاعری کی روح جو الفاظ کے صناعی کا نتیجہ ہوتی ہے معدوم ہے لیکن چکبست کا کلام قدیم اور جدید دونوں طرح کی شاعری کے محاسن کا مجموعہ ہے۔ ان کی زبان فصیح بیان دلکش، مضامین بلند اور خیالات عالی ہیں۔ چکبست کے تمام کلام میں متانت، وقار، اور بلند اخلاقی موجود ہے۔ کہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سنجیدگی سے دور ہو جسمیں رکاکت اور ابتذال کا شائبہ بھی ہو۔ ایک مبصر نے سچ کہا ہے کہ :-

---

[۵] پنڈت برج نرائن چکبست۔ یادگار چکبست۔ مرتب آنند نرائن ملاّ صفحہ ۵۹

جو شعراء اُردو شاعری کو ارتقائے قوم اور تہذیبِ اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں ان میں چکبست سب سے آگے ہیں۔"

ڈاکٹر تارا چند صاحب فرماتے ہیں[1]:-

"۴۴ سال کی مختصر زندگی میں اس کا ذہن، ان مدارج کو طے کرکے، جن میں عقلی انسانی فرد و جماعت کی زندگی کے ظاہری و اجمالی اصولوں کو پہچانتی ہے۔ ان گہرائیوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا جن کا تعلق تحقیق فلسفہ ہے۔ افسوس! زمانے نے مہلت نہ دی، اور اُردو شاعری کو محبت، اور معرفت کے اس پورے پیام سے محروم کر دیا جسے سنانے کے لئے سچا وطن پرست اور فراخ دل شاعر تیاری کر رہا تھا ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

پروفیسر آل احمد سرور صاحب فرماتے ہیں[2]:-

"چکبست نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سرعت سے بدل رہا تھا۔ ایک طرف قدامت کا رنگ تھا جو ابھی سماج پر چھایا ہوا تھا اور دوسری طرف نئی تہذیب کی بڑھتی اور چڑھتی ہوئی روشنی تھی جو آہستہ آہستہ اپنا اثر جما رہی تھی۔ اس ماحول میں طبائع زیادہ مشتعل اور معیار زیادہ سخت تھے کچھ لوگ قدامت پرست تھے۔ کچھ ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو تھوڑی اصلاح تھوڑی سے تبدیلی تھوڑی سی رفوگری کے قائل تھے۔ چکبست اس آخری طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اقبال کی زبان میں ان کا قلب مومن اور دماغ کافر تھا۔ وہ لکھنؤ کی تہذیب، تمدن، معاشرت اور اخلاق کے دلدادہ تھے مگر اس کے ساتھ زمانہ کا رخ دیکھ کر اور روشن اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ

---

[1] چکبست کی انفرادیت۔ یادگارِ چکبست۔ مرتب آنند نرائن ملا صفحہ ۸۰

[2] پنڈت برج نرائن چکبست۔ تنقیدی اشارے از آل احمد سرور صاحب صفحہ ۱۰۹

سے اصلاح و ترمیم کے بھی حامی تھے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر اچھے نقاد اور ایک اچھے اہل قلم تھے بلکہ اچھے انسان بھی تھے وہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو صرف عزت و آرام کی زندگی گذارنے پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ قوم کی بہبودی اور بہتری کے لئے نہایت نیک خیالات قدرتاً معتدل اور صلح پسند خیالات ہوتے ہیں۔ چکبست دورِ جدید کے شعراء میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔"

اگر انکے عہد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی قومی، اور ملی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ان کو "شاعر ہند" کے نام سے یاد کرنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ ان کی وطنی اور قومی شاعری اس زمانہ کی آواز ہے جس زمانہ کے وہ شاعر تھے اور شاید اسی چیز نے پروفیسر احتشام حسین صاحب کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا[۱]۔

"مختصر یہ کہ چکبست نے اس دور جدید کا احساس کر لیا تھا اور اس کی وہ اہم خصوصیتیں جو ہندوستان کو ترقی کی راہ پر لگا سکتی تھیں انکی شاعری کا پیام بن گئیں حقیقتاً پیام میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ اسوقت کی فضا کا یہی مطالبہ تھا کہ حب وطن کا نعرہ لگایا جائے۔ اور قومیت کا شیرازہ آئینی جدوجہد سے منظم کیا جائے اہمیت اس میں ہے کہ چکبست نے اس پیام کو کسطرح پیش کیا۔ اسکے لئے آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قومی جوش و خروش، حب الوطنی۔ اظہار خیال کی آزادی کا مطالبہ اور معاشرتی اصلاح کے پیش کرنے کا بہترین سانچہ چکبست کی شاعری تھی جسمیں بیک وقت جوش۔ تڑپ۔ گداز۔ خلوص اور حقیقت موجود ہیں۔ اور جس سے مل کر چکبست کی قادر الکلامی نے بے جان لفظوں میں جان اور بے روح محاوروں میں روح پیدا کر دی۔ انکی شاعری ہمارے گذشتہ قومی تصور کا ایک حسین مرقع ہے اور ایک پر اثر پیغام۔"

اس طرح چکبست اُردو ادب کے کاروان میں محض ایک راہرو نہیں رہبر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" کبھی آراستہ ہوا (اور تاریخ ادب میں آراستہ ہوتا ہی رہتا ہے) تو چکبست بھی اُردو کے

۱۔ پیام دورِ جدید۔ از احتشام حسین صاحب۔ یادگار چکبست۔ صفحہ ۱۴۷ مرتب آنند نرائن ملا۔

اہم ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش نظر آئینگے کیونکہ انھوں نے خلوص کے ساتھ اُردو ادب کی خدمت کی اور ایسے زندہ کارنامے چھوڑے ہیں جنکے نقوش تاریخ ادب پر گہرے ہیں ؎

تھکے ماندے مسافر ظلمتِ شامِ غریباں میں
بہارِ جلوۂ صبحِ وطن کو یاد کرتے ہیں!

ضمیمہ

اس مقالہ کے مواد کی تلاش میں چکبست کی ایک غزل کے چند شعر اور راماین کے تین بند دستیاب ہوئے۔ جو انکے دیوان صبح وطن میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ راماین کے جو بند ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف مقامات کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چکبست نے کئی اور سین کہہ لئے تھے جو انکے مجموعہ میں شامل نہ ہو سکے اور جو اب دستیاب بھی نہیں ہوتے۔ صبح کے وقت رام چندر جی کے رخصت سے قبل اودھ کی کیا حالت تھی ؎

ہے آج راگ رنگ کے بدلے نیا سماں　　گھڑیال کی صدا ہے نہ ہے دید کا بیان
بازار میں نہ پھل ہے نہ پھولوں کی ڈالیاں　　دریا پہ گل فروش نے کھولی نہیں دکان
لب پر برہمنوں کے دعائے سحر نہیں
پٹ مندروں کے بند پڑے ہیں خبر نہیں

رام چندر جی کی زیارت کے لئے لوگوں کے اشتیاق کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

یوں مجمع کثیر میں جنبش ہوئی عیاں　　جیسے ہوا سے ہلتی ہیں جنگل کی پتیاں
اللہ رے انتظار کا وہ آخری سماں　　کھنچ آئی تن سے کان کے پردے کے پاس جاں
سر اٹھ گئے تڑپ کے نظر سوئے در گئی
سینہ میں سانس آنکھ میں پتلی ٹھہر گئی

اس جانکاہ واقعہ یعنی جدائی اودھ کا سیتا جی پر کیا اثر ہوا ؎

ہلچل میں اس سفر کے ہے سیتا پہ یہ گماں　　گویا کنول کا پھول ہے لہروں کے درمیاں
معصوم دل ہے رنج اٹھانے سے شادماں　　تن پر ذرا لباس فقیری نہیں گراں
نیچی نگاہ آنکھ زمیں سے لڑی ہوئی
سر میں فقط سہاگ کی لالی پڑی ہوئی

غزل کے اشعار :-

باعثِ ننگ نہ اے گوشہ داماں ہونا
خارِ صحرائے جنوں سے نہ پشیماں ہونا

لاش پر قیس کی دل میں یہ کہا لیلیٰ نے
آج معلوم ہوا نجد کا ویراں ہونا

عمر سب گوشہ تاریک قفس میں گذری
ہم نہیں جانتے ہیں صبح کا خنداں ہونا

اہلِ غیرت کا ہے یہ قول مسیحا سے بھی
موت سے کم نہیں منت کشِ درماں ہونا

ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں
ایک غنچہ میں تماشا ہے گلستاں ہونا

ہم گنہگاروں کو منظور نہ تھا اے خالق
حشر کے دن تیری رحمت سے پشیماں ہونا

ہے نکلنا کسی ناشاد کے ارمانوں کا
پردہ ابر سے تاروں کا نمایاں ہونا

سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیڑی نہ رہی
میری تقدیر میں تھا بے سروساماں ہونا

ہم تو زنجیر کے مشتاق ہیں اے جوشِ جنوں
شرط ہے تیرے لئے سلسلہ جنباں ہونا

خون رلواتا ہے گردوں انہیں معصوموں کو
سادگی سے جنھیں آتا نہیں گریاں ہونا

ہم اسیروں کی دعا ہے کہ چمن سے اک دن
دیکھتے خانہ صیاد کا ویراں ہونا

کل بھی وہ کل جو ہے فردائے قیامت زاہد
اور پھر اسکے لئے آج پریشاں ہونا

پردۂ غیب سے گل چاک گریباں نکلے
قہر تھا بلبل ناشاد کا نالاں ہونا

میں بھی مشتاق تجلی ہوں مگر ہوں خاموش
یاد ہے طور پر موسیٰ کا پشیماں ہونا

ہوں جنوں میں بھی اگر ناز اٹھانے والے
سہل ہے گل کی طرح چاک گریباں ہونا

۱- آب حیات — مولانا محمد حسین آزاد
۲- ادبی اور قومی تذکرے حصہ اول } پنڈت کشن پرشاد کول
۳- " " " دوم }
۴- اُردو تنقید کا ارتقا — ڈاکٹر عبادت بریلوی
۵- اُردو شاعری پر ایک نظر — کلیم الدین احمد
۶- ادب اور سماج — احتشام حسین
۷- اُردو غزل کا نشوونما — ڈاکٹر رفیق حسین
۸- اُردو غزل — ڈاکٹر یوسف حسین

۹۔ اُردو غزل گوئی — فراق گورکھپوری
۱۰۔ ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن
۱۱۔ ادب اور زندگی — مجنوں گورکھپوری
۱۲۔ بہارِ گلشنِ کشمیر، جلد اول مرتب دیوان برادھے ناتھ کول گلشن
۱۳۔ " " " " دوم " "
۱۴۔ تنقیدی اشارے — آل احمد سرور
۱۵۔ تاریخ ادب اُردو — رام بابو سکسینہ
۱۶۔ تاریخ اقوام کشمیر — غلام حسین صاحب فوق
۱۷۔ تنقیدی جائزے — پروفیسر احتشام حسین
۱۸۔ جدید اُردو شاعری — عبدالقادر سروری
۱۹۔ چھان بین — جعفر علیخاں اثر
۲۰۔ حیات جاوید — الطاف حسین حالی
۲۱۔ حیات سعدی — " "
۲۲۔ خمخانۂ جاوید (تذکرہ ہزار داستان) لالہ سری رام
۲۳۔ دہلی کا دبستان شاعری — ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
۲۴۔ راج ترنگی — کلن پنڈت
۲۵۔ سودا — شیخ چاند
۲۶۔ شعر الہند، جلد اول و دوم — مولانا عبدالسلام ندوی
۲۷۔ عہد حاضر کی اُردو غزلگوئی۔ عندلیب شادانی
۲۸۔ غزل اور مطالعۂ غزل۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی
۲۹۔ کملا — برج نرائن چکبست
۳۰۔ گلدستۂ پنچ — مرتب پنڈت کشن پرشاد کول
۳۱۔ گل رعنا — عبدالحئی
۳۲۔ گوکھلے کی تقریریں — مرتب کشن پرشاد کول
۳۳۔ لکھنوی شاعری — میر باقر شمس
۳۴۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۳۵۔ میری کہانی — پنڈت جواہر لال نہرو
۳۶۔ مضامین الہلال — مولانا ابوالکلام آزاد
۳۷۔ مضامین سرسید احمد — سرسید احمد
۳۸۔ مقالات حالی — ڈاکٹر عبدالحق
۳۹۔ مختصر تاریخ ادب اُردو۔ ڈاکٹر اعجاز حسین
۴۰۔ مباحثہ گلزار نسیم — مرزا محمد شفیع شیرازی
۴۱۔ مضامین چکبست — برج نرائن چکبست
۴۲۔ مقدمہ شعر و شاعری — مولانا الطاف حسین حالی
۴۳۔ موج کوثر — اکرام
۴۴۔ نئے ادبی رجحانات — ڈاکٹر اعجاز حسین
۴۵۔ نگارستان کشمیر — قاضی ظہور الحسن ناظم
۴۶۔ نئے پرانے چراغ — آل احمد سرور
۴۷۔ نیرنگ خیال — مولانا محمد حسین آزاد
۴۸۔ نیا ادب — پنڈت کشن پرشاد کول
۴۹۔ ہندوستانی مسلمان — محمد صادق
۵۰۔ ہماری شاعری — پروفیسر مسعود حسن
۵۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا روشن مستقبل — طفیل احمد
۵۲۔ یادگار چکبست — مرتب آنند نرائن ملا
۵۳۔ یاد حالی — ڈاکٹر عبدالحق
۵۴۔ یادگار حامد — مرتب صفی مرحوم

رسالہ جات

۱۔ اودھ پنچ — سجاد حسین
۲۔ الناظر — ظفر الملک علوی
۳۔ ادب — اعظم حسین
۴۔ آج کل — جوش ملیح آبادی
۵۔ بہار کشمیر — پنڈت پران ناتھ کردایوں
۶۔ تہذیب الاخلاق — سرسید احمد خاں

۷۔ زمانہ — دیانرائن نگم — ۱۱۔ مراسلہ کشمیر — پنڈت سیونرائن بہار

۸۔ صبح امید — پنڈت برج نرائن چکبست — ۱۲۔ نگار — نیاز فتح پوری

۹۔ کشمیر درپن — زیرادارت سرسپرو — ۱۳۔ نقوش — طفیل احمد

۱۰۔ ماہنامہ آزاد — سید مہندی — ۱۴۔ نئی نسلیں — م۔ نسیم

انگریزی کتب

1. Beauchamp, J. — British Imperialism in India.
2. Basu, M. — Consolidation of Christian Power in India
3. Basu- — Expansion of Christian Power in India
4. Chintamani - C.Y. — Indian Politics Since Mutiny
5. Cummying -Sir. — Political India.
6. Day, R. — Social Reforms.
7. Dutt, R.P. — India To-day
8. Desai A.R. — Social Background of Indian Nationalism.
9. Dar. B.N. — Speeches and Writings.
10. Das Dr. Bhagwan — A History of the Hindu Muslim Problem in India.
11. Garret — The Legacy of India
12. Latif Dr. A. — Influence of English Literature on Urdu.
13. Mukerjee H. — India's Struggle for Freedom
14. Muttoo H.N. — Kashmiri Pandits Outside Kashmir
15. O' Mally — India and the West
16. Qadir, Sir A. — Emminent Urdu Writers
17. Rai, L. — Unhappy India
18. Sita ramayya, P.B. — History of Congress
19. Strachey Sir J. — Political India.